بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۳ ۱۰؍جنوری ۲۰۲۶ء مطابق ۲۰؍رجب ۱۴۴۷ھ شمارہ نمبر ۵

اس شمارے میں

شعر وادب	مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ	۴
’’اللھم بارک لنا فی رجب...‘‘	محمد عمیر الصدیق ندوی	۵
تفسیر سورۂ فاتحہ	حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی	۷
کامل اور یقینی علم صرف اللہ کا ہے	عبدالرشید راجستھانی ندوی	۸
تعمیر کے پردہ میں تخریب	حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ	۹
مذہب بہ مقابلہ الحاد	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۱۱
نیا سال: نئے عزائم اور نئے حوصلے	ڈاکٹر سراج الدین ندوی	۱۴
مبلغ افسر کی داستانِ حیات	جناب شارق علوی	۱۶
آر ایس ایس کی تعلیمی کاوشیں اور مسلمان	ڈاکٹر محمد سعود اعظمی ندوی	۱۷
فقہی اختلاف اور سلف کا طریقۂ کار	ڈاکٹر سید عبدالرشید	۱۹
مصلحت پسندی اور اسلام	طلحہ نعمت ندوی	۲۱
معاشرتی اجتماعیت کا فقدان	محمد اسعد ندوی	۲۳
فیک نیوز کا فتنہ	منور سلطان ندوی	۲۵
ماں باپ کا احسان: قرض، جو کبھی ادا نہ ہو	محمد جاوید اختر ندوی	۲۸
تعارف وتبصرہ	محمد اصطفاء الحسن ندوی	۲۹
جمہوریت-ایک سیاسی واخلاقی کشمکش	محمد نفیس خان ندوی	۳۱
سوال وجواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۳۳

سرپرست

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول

شمس الحق ندوی

نائب مدیر

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

محمد نفیس خان ندوی ❁ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❁ مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرِتعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT
A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)
IFSC Code : SBIN0000125 – Swift Code : SBINNB157
State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہِ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

TAMEER–E–HAYAT
Tagre Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Call : 9559844716
website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/500	فی شمارہ -/25	ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے۔ $100

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر ₹30/= جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کرا کے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعروادب

اُلفت ہے دل میں شاہِ زمن کی بھری ہوئی

مولانا ابوالکلام آزادؒ

موزوں کلام میں جو ثنائے نبی ہوئی
تو ابتدا سے طبعِ رواں منتہی ہوئی

ہر بیت میں جو وصفِ پیمبر رقم کیے
کاشانۂ سخن میں بڑی روشنی ہوئی

ظلمت رہی نہ پرتوِ حسنِ رسول سے
بیکار اے فلک شبِ مہتاب بھی ہوئی

ساقیٔ سلسبیل کے اوصاف جب پڑھے
محفل تمام مستِ مئے بے خودی ہوئی

دل کھول کر رسولؐ سے میں نے کیے سوال
ہرگز طلب میں عار نہ پیشِ سخی ہوئی

تاریک شب میں آپؐ نے رکھا جہاں قدم
مہتاب نقشِ پا سے وہاں روشنی ہوئی

ہے شاہِ دیں سے کوثر و تسنیم کا کلام
یہ آبرو تمام ہے حضرت کی دی ہوئی

سالک ہے جو کہ جادۂ عشقِ رسول کا
جنت کی راہ اس کے لیے ہے کھلی ہوئی

آزادؔ اور فکر جگہ پائے گی کہاں
الفت ہے دل میں شاہِ زمن کی بھری ہوئی

☆☆☆

تیری رحمت ہے سبب میری سبک ساری کا

مولانا محمد علی جوہرؒ

ڈر نہیں مجھ کو گناہوں کی گراں باری کا
تیری رحمت ہے سبب میری سبک ساری کا

دار نے اِک سگ دنیا کو یہ بخشا ہے عروج
ہے فرشتوں میں بھی چرچا مری دیں داری کا

دل و جاں سونپ چکے ہم تجھے اے جانِ جہاں
اب ہمیں خوف ہی کیا اپنی گرفتاری کا

جان بھی چیز ہے کوئی کہ رکھیں تم سے دریغ
پاس اتنا بھی نہ ہو رسمِ وفاداری کا

ساقیا سب کو تری ایک نظر کافی تھی
تھا کسے ہوش ترے عہد میں ہشیاری کا

میں فدا، آج بھی ہو جائے وہی ایک نگاہ
خاتمہ ہو کہیں اس دور کی خودداری کا

عاشقوں کے لیے ہے دار ہی داروئے شفا
عشق کی طب میں دوا نام ہے بیماری کا

اجل استادہ ہے بالیں پہ مریضِ غمِ عشق
آنکھ تو کھول ذرا وقت ہے بیداری کا

جوہرؔ اور حاجب و درباں کی خوشامد کیا خوب
عرش و کرسی پہ گزر ہے ترے درباری کا

☆☆☆

اداریہ

"اللھم بارک لنا فی رجب..."

محمد عمیر الصدیق ندوی

دنوں اور مہینوں کی تخلیق کا آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے ربط، پھر بارہ مہینوں میں چار مہینوں کا امتیازی درجہ، پھر دنوں کی تخصیص، ایامِ معلومات اور ایامِ معدودات، ستۃ ایام، ایک یوم جس کا پھیلاؤ پچاس ہزار سالوں پر محیط۔ یہ اور اس جیسے قرآنی اشارات، رات اور دن اور عدد السنین کو جاننے اور ان کے بارہ میں باتیں کرنے کے لیے قدرتاً دلچسپی کے اسباب پیدا کرتے رہتے ہیں۔ خاص طور پر قمری یا اسلامی مہینوں کے نام سے ان کی صفات کی نسبت اور معنویت جیسے پہلو مسلسل ذہن و قلب کو غور و فکر کی دعوت دیتے رہتے ہیں، اور سمجھاتے رہتے ہیں کہ اس دنیا میں سانسوں کی آمد و رفت کے لیے جو وقفہ عطا کیا گیا ہے اس کی محدودیت پر نگاہ جمی رہے، کہ وقت کے پیمانے ہر انسان کے لیے اور ازل سے اجل تک کے لیے 'مقدر' کی شکل میں طے کر دیے گئے ہیں۔

ایک موجودہ رجب المرجب ہی نہیں، ہر انسان کے لیے ہر مہینہ بس یہی پیغام رہتا ہے کہ جاہلی روش کی پیروی اور دستورِ الٰہی سے دوری کی سنگینی اور برائی کو سمجھ لینا، یہی وقت کا دائمی تقاضا ہے، یہی الدین القیم ہے، یہی سیدھی راہ ہے، اور یہی ماہ و سال کے پردے میں نہاں سیدھا اور صحیح حساب ہے۔

رجب کا مہینہ بھی سیدھی راہ اور سیدھے حساب کی وہ تعبیر ہے جس کی معنویت ہی اس کی عزت، ہیبت اور عظمت کی خبر دیتی ہے۔ عزت و عظمت کی عمارت اگر واقعی اور حقیقی بنیادوں پر قائم ہو تو اس کو زمانہ کے الٹ پھیر زیادہ متاثر نہیں کرتے۔

رجب کا مہینہ اسلام سے پہلے بھی عرب اور مکہ معظمہ کے معاشرہ میں اپنی ممتاز حیثیت رکھتا تھا، اور وہ اس طرح کہ زمانۂ جاہلیت کے حج کے لیے جو عمرہ لازمی تھا وہ اسی مہینہ میں ادا کیا جاتا، اور شاید اسی عزت و امتیاز کا اثر تھا کہ جنگ و جدال کے خوگر مکہ کے قبائل جن مہینوں میں از خود جنگ سے باز رہتے تھے ان میں ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم کی باقاعدہ ترتیب سے الگ رجب کے مہینہ کی شمولیت اس کے امن و سلامتی کی شناخت والے مہینہ کی حیثیت کا جدا اعلان تھی۔

زمانۂ جاہلیت کا یہ امتیاز اسلام میں اس طرح نمایاں ہوا کہ یہ قرآن مجید کی بے مثال دولت و نعمت سے معمور ماہِ رمضان اور اس کی بہاروں کا پتہ دینے خوشبوؤں کا استقبالی رخِ زیبا بن گیا۔ رجب کے چاند میں ایمان و قرآن والوں کی نظریں ہلالِ رمضان کا عکس دیکھنے لگیں۔ اسی رجب کے چاند سے وہ اشارے بھی سامنے آنے لگے کہ وہ أیام معدودات قریب سے قریب تر ہونے لگے ہیں، جو خیر و برکت کی دولتوں سے مالا مال ہیں۔ روایتیں، زبانوں پر آج تک جاری ہیں کہ ہمارے حضورؐ کا اسی رجب کے مہینہ سے ماہِ رمضان کا ارمان اور سوا ہو جاتا۔ شوق کی ساعتوں کی شدت دیکھیے کہ شعبان کو بھی اسی ماہِ رجب کا جزو سمجھا جانے لگا۔ 'رجبین' کہہ کر رجب و شعبان کی تفریق کی حد ہی ہٹانے کا جذبہ پیدا ہو گیا، کہ یہ چند دنوں کی دوری جیسے سہی نہ جاتی ہو۔ بارانِ رحمت سے پہلے پُر کیف گھٹاؤں اور بھیگی بھیگی ہواؤں کو 'مبشرات بین یدی رحمته' کے الفاظ دیے گئے۔ بشارت و بشاشت دونوں خبر و نظر کے لیے سرمایۂ حیات ہیں۔ اسی طرح رجب کے مہینہ سے چلنے والی رمضان کی بشارت کی دولت کی خبر دینے والی ہواؤں کا تصور رجب کے مہینہ کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے!!۔

رجب کے مرجب ہونے کے لیے بس یہی کافی تھا؛ لیکن روایتوں کو اگر تسلیم کرنے کی چاہت ہو تو یہ یاد کرنے اور یاد رکھنے میں کیا دشواری کہ اسی مہینہ کو معبودیت اور عبدیت کے تمام اسرار عیاں کرنے والے واقعہ کی نسبت بھی حاصل ہے۔ انسانی وجود کی پوری تاریخ میں صرف ایک

ایسی رات اسی مہینہ کے حصہ میں آئی جہاں خالقِ کائنات نے، جو ہر نقص وکمی سے پاک، ہر شائبۂ عجز سے پاک، اور ہر گمان وتحدید سے پاک ہے...... اس ذاتِ پاک نے اپنے ایک بندہ کو لفظِ ’عبدٗ‘ کی ان عظمتوں سے سرفراز کیا کہ جاننے والے کہہ اٹھے کہ ہمارے حضورؐ سے ’**بعبدہ**‘ کی نسبت نے ’عبدٗ‘ کے لفظ کو وہ عظمت عطا کردی کہ پھر عزت وشان کا کوئی لفظ اس کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ ’**بعبدہ**‘...... ’عبدٗ‘ کے ساتھ معبود کی اس نسبت کے بعد شرف وتکریم کا اور پیرایہ رہ ہی کہاں جاتا ہے۔ اس کمالِ عبدیت وعبودیت کی نسبت بقول مولانا گیلانیؒ گواہ بن گئی کہ اللہ نے اپنے بندہ کو جو مغلوبیت کے ظاہری احوال میں ہر طرح سے گھرا ہوا تھا‘ معراج کی کس انتہائی بلندی تک پہنچا دیا، اور ایک ایسا بندہ جو مکہ کی وادیوں میں بظاہر بے بس تھا‘ اس کو کس درجہ بے مثال حد تک پہنچا دیا۔ عروجِ بنی آدم کے اس انتہائی سفر کو ’معراج‘ کا نام دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ کی ایک شان ’**ذی المعارج**‘ کی ہے۔ رجب کی قسمت بھی کیا خوب ہے کہ ذی المعارج نے اپنے سب سے محبوب بندہ کو مقامِ معراجیت سے نوازنے کے لیے اسی مہینہ کی ایک رات کا انتخاب کیا۔ ہمارے حضورؐ کے طفیل میں دراصل یہ انسانوں کی عزت وتکریم کی سب سے بڑی علامت اور سب سے بلند پرواز بن گئی۔ حظیرۂ قدس اور بارگاہِ لامکان تک انسانی وجود کی اس پرواز کی معنویت ’معراج‘ کے سوا اور کسی لفظ سے سمجھی جاسکتی ہے؟۔ حقیقت یہی ہے کہ واقعۂ ’اسراء‘ یا ’معراج‘ کی کیفیات لامحدود وبے کراں ہیں۔ ان کے لیے بھی جن کی نظر اور قلب کی رسائی اور گہرائی ہمارے اپنے معیار کے لحاظ سے کہیں زیادہ وسیع اور محیط ہے؛ لیکن رجب، معراج، رمضان کی نسبتوں سے اتنا تو ہم بھی محسوس کرسکتے ہیں کہ اور کچھ نہیں، صرف پانچ وقتوں کی نماز کی سوغات جو اسی معراج کی دین ہے‘ وہی انسانیت کی معراج کی بھی ضامن ہے۔ باقی معراج نے جو کچھ عالمِ انسانیت کو دیا‘ اس کے بیان اور تفصیل کے لیے بڑی بڑی کتابیں اور مباحث ہیں۔ ہم تو صرف رجب کی ترحیب کے لیے قلب ونظر کو سراپا انتظار، سراپا شوق کی لذت کا کچھ سامان کرنا چاہتے ہیں۔ ☆☆☆

علم کا ربط اسمِ الٰہی سے

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

علم جب صفاتِ الٰہی سے، اس کی قدرتِ کاملہ اور حکمت ودانائی اور خدائے بزرگ وبرتر کی عظمت سے منسلک ہوجاتا ہے تو ترقی کی منزلیں طے ہونے لگتی ہیں، اسرارِ کائنات منکشف ہوتے ہیں، قومیں تعمیری کاموں میں لگ جاتی ہیں، پھر ایسا علم انسان کو منافرت، تفرقہ اور تخریب کاریوں سے بچاتا ہے، انھیں ان لعنتوں سے دور رکھتا ہے، اللہ کے نام کی رہنمائی میں خدا کی وحدانیت اور خوفِ خدا کے نشہ میں سرشار کرکے علم انسانوں کو ترقی کی معراج سے سرفراز کرتا ہے۔

انگریز مصنف آرتھر نے انتہائی صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ علم جب خدا کے نام سے بے نیاز ہوجاتا ہے، تو تباہی وبربادی کا باعث بن جاتا ہے، اسم الٰہی کے بغیر علم انسانوں میں جذبۂ رعونت پیدا کرتا ہے، انسان یہی سمجھتا ہے کہ میں اس دنیا کی قیمت ہوں، انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی ہستی کو نہ بھولے، اِقْرَأْ آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی توجہ اس نکتہ کی جانب مبذول کرائی ہے، قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، اس سے اللہ کو بتانا مقصود ہے کہ انسان کی حیثیت ہی کیا ہے، وہ اپنی ہستی کو نہ بھولیں، خدائے بزرگ وبرتر نے اس ’’اِقْرَأْ‘‘ آیت میں یہ سمجھا دیا ہے کہ انسانوں کو چاہیے کہ اللہ کی عظمت، بزرگی اور اس کے قادرِ مطلق ہونے کو کبھی نہ بھولیں، جو اللہ خون کے لوتھڑے سے انسانوں کو پیدا کرسکتا ہے، اس کے قبضۂ قدرت میں پوری کائنات ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ ہے، لہٰذا علم کو چاہیے کہ وہ اسم سے جڑا رہے، قرآنی تعلیمات سے بے بہرہ نہ رہے، انسان اللہ سے بے نیاز نہ رہے، یہ صفت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے کہ وہ سب سے بے نیاز ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں؛ بلکہ سب اس کے محتاج ہیں، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ علم کی دولت اور اس کی نعمتوں سے فیض یاب تو ہوں، لیکن علم کا ربط اسم (اللہ تعالیٰ) سے جوڑے رکھیں، اور جب قومیں یہ انداز اپنا لیتی ہیں تو دنیا کی دولت، جاہ وحشم سب کچھ ان کے قدموں میں ہوتا ہے اور تعمیری کام انجام پاتے ہیں۔ ☆☆☆

تعلیم القرآن

تفسیر سورۂ فاتحہ

گزشتہ سے پیوستہ

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء)

{إِيَّاکَ نَعْبُدُ وإِيَّاکَ نَسْتَعِينُ}

(اے اللہ! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔)

سورۂ فاتحہ کی ابتدائی تین آیتوں میں اللہ کی اس انداز سے حمد وثنا کی گئی ہے کہ اس کی تلاوت کرنے والوں کو ایک حضوری کی کیفیت نصیب ہوجاتی ہے، ان آیتوں میں اللہ کی صفات کا بیان ہے، اس کی رحمت کا ذکر ہے پھر اس کی قہاریت کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے یعنی ایک طرف اس کی صفاتِ جمالیہ کا ذکر ہے اور دوسری طرف اس کی صفاتِ جلالیہ کا بھی تذکرہ ہے، جب آدمی نے اپنے رب کی اس طرح تعریف کی تو گویا اب وہ اس کے روبرو آگیا، اسی لیے اب اللہ کو براہِ راست خطاب ہورہا ہے کہ عبادت کی مستحق بھی تیری ذات ہے اور استعانت کی مستحق بھی صرف تیری ہی ذات ہے، اس سے شرک کی ساری جڑیں کٹ کر رہ جاتی ہیں۔ یہ پوری آیت ایک ہی جملہ ہے {إِيَّاکَ نَعْبُدُ} میں دعوے کی صورت تھی اور {إِيَّاکَ نَسْتَعِينُ} بڑھا دینے سے اس کی نفی ہوگئی کہ عبادت تو ہم کرتے ہیں مگر یہ عبادت بھی محض تیری ہی مدد اور توفیق کی بنا پر ہے، ورنہ اپنے کیے سے کیا ہوسکتا تھا؟! سچی بات یہ ہے کہ یہ ایک بلیغ تعبیر ہے، جب روز جزا کا ذکر آیا تو بندہ کو یہ احساس ہوا کہ ہمیں روز جزا میں کامیابی حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور اس کامیابی کے راستے کو اختیار کرنا ہمارے لیے اسی وقت ممکن ہے جب اللہ کا فیصلہ ہو، اس کی مرضی کے مطابق اس کی بندگی ہو اور اس میں اللہ کی مدد بھی شامل حال ہو۔

''عبادت'' اور ''استعانت'' یہ دونوں ہی جملے باہم بہت مربوط ہیں اور اس پیرایہ بیان میں گویا اللہ تبارک وتعالیٰ نے بندہ کو یہ سکھا دیا کہ وہ کس طرح دعا کرے اور یہ بات بھی سمجھے کہ وہ جو بندگی کررہا ہے حقیقت میں اس کی توفیق بھی اللہ ہی کے فضل سے حاصل ہوتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جس طرح اسلام میں اللہ کے سوا کسی دوسرے کی بندگی جائز نہیں، ٹھیک اسی طرح اللہ کے علاوہ کسی سے استعانت کا بھی تصور نہیں، یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ دنیا میں ہم ایک دوسرے سے اپنی ضرورت پوری کرنے کا جو سوال کرتے ہیں مثلاً: کھانا کھلا دو یا پانی پلا دو، یہ چیزیں ''استعانت'' میں داخل نہیں ہیں، یہ تو ظاہری اسباب ہیں جن میں آدمی ایک دوسرے کی مدد کرتا ہے اور ایک دوسرے سے مدد چاہتا ہے۔

اللہ سے مدد چاہنا جس کو ''استعانت'' کہا گیا اس کا مطلب یہ ہے کہ بغیر اسباب اختیار کیے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل حاصل ہو، اس لیے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اسباب بس سے باہر ہوجاتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسباب کام نہیں دیتے، اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے سبب پیدا کردیتا ہے اور جب کبھی چاہتا ہے تو بغیر سبب کے ہی دے دیتا ہے۔ حضرت عمران کی بیوی نے دعا کی تو اللہ نے بیٹے کے بجائے بیٹی عطا فرمائی اور پھر ان کے بطن سے اپنے خاص فضل سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا فرمادیا۔ اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام نے دعا کی:

{رَبِّ هَبْ لِيْ مِن لَّدُنکَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً إِنَّکَ سَمِيْعُ الدُّعَاءِ} (آل عمران: ۳۸)

(اے میرے رب! اپنے پاس سے مجھے اچھی اولاد عطا فرما بے شک تو دعا کا خوب سننے والا ہے۔)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی دعا سن لی، وہ بوڑھے ہوچکے تھے اور بظاہر اسباب بھی منقطع ہوچکے تھے لیکن اللہ نے فرمایا:

{يَا زَکَرِيَّا إِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلَامٍ اسْمُهُ يَحْيَىٰ} (مریم: ۷) (اے زکریا! ہم تمہیں ایک بچے کی خوش خبری دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہے۔)

اس بشارت پر حضرت زکریا علیہ السلام نے تعجب کیا اور فرمایا:

{أَنَّىٰ يَکُونُ لِيْ غُلَامٌ وَکَانَتِ امْرَأَتِيْ عَاقِرًا وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ عِتِيًّا} (مریم: ۸)

(اے میرے رب! میرے بچہ کس طرح ہوگا جب کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بھی بڑھاپے کی اس انتہا کو پہنچ گیا ہوں کہ گویا خشک ہوچکا ہے)

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ ارشاد ہوا:

{قَالَ کَذَٰلِکَ قَالَ رَبُّکَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَقَدْ خَلَقْتُکَ مِن قَبْلُ وَلَمْ تَکُ شَيْئًا} (مریم: ۹)۔ (کہا ایسا ہی ہوگا، تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ یہ تو میرے لیے معمولی بات ہے اور میں نے پہلے تم کو بھی تو پیدا کیا جب کہ تم کچھ نہ تھے۔)

(باقی صفحہ نمبر ۱۰؍پر)

تعلیم الحدیث

کامل اور یقینی علم صرف اللہ تعالیٰ کا ہے

عبدالرشید راجستھانی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: "مَفَاتِيحُ الْغَيْبِ خَمْسٌ، لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا اللهُ: لَا يَعْلَمُ مَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ إِلَّا اللهُ، وَلَا يَعْلَمُ مَا فِي غَدٍ إِلَّا اللهُ، وَلَا يَعْلَمُ مَتَى يَأْتِي الْمَطَرُ أَحَدٌ إِلَّا اللهُ، وَلَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِلَّا اللهُ، وَلَا يَعْلَمُ مَتَى تَقُومُ السَّاعَةُ إِلَّا اللهُ۔" (البخاري: ۷۳۷۹)

ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: غیب کی کنجیاں پانچ ہیں، انہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ماؤں کے پیٹ میں ہونے والی ہر طرح کی کمی اور زیادتی کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، کل کیا پیش آنے والا ہے یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، بارش کب نازل ہوگی یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، کوئی یہ نہیں جانتا کہ کس زمین پر اس کی موت آئے گی، اور قیامت کب قائم ہوگی یہ بھی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

تشریح: اللہ تعالیٰ کا علم کامل اور ہر نقص سے پاک ہے۔ جو کچھ ظاہر ہے اور جو نگاہوں سے اوجھل ہے، سب اس کے علم میں ہے۔ آسمان وزمین، ماضی وحال اور مستقبل کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں اسی حقیقت کو نہایت جامع اور واضح اسلوب میں بیان فرمایا ہے۔

حدیث کا مجموعی مفہوم یہ ہے کہ انسانی زندگی سے وابستہ چند بنیادی امور ایسے ہیں جن میں انسان کا علم محدود اور ناقص ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کا علم یقینی اور مکمل ہے۔

ان پانچ باتوں کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ انسان کی پیدائش، اس کی زندگی کے فیصلے، اس کی روزی اور اس کا انجام انہی کے گرد گھومتا ہے۔

ماں کے پیٹ میں بچہ مختلف مرحلوں سے گزرتا ہے۔ بعض ظاہری امور بعد میں معلوم ہو جاتے ہیں، مگر یہ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ بچہ حقیقت میں کیسا ہوگا، اس کی زندگی کا رخ کیا ہوگا، کتنی عمر پائے گا اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ یہ سب امور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں، جس سے واضح ہوتا ہے کہ بندہ اپنی ابتدا ہی سے اپنے رب کا محتاج ہے۔

اسی طرح انسان کل کے لیے منصوبے بناتا اور اندازے لگاتا ہے، مگر اکثر حالات اس کے خیال کے مطابق نہیں ہوتے۔ آج کا منصوبہ کل بدل جاتا ہے اور انسان خود محسوس کر لیتا ہے کہ اصل اختیار اس کے پاس نہیں۔ یہی احساس دل میں اللہ پر بھروسا اور عاجزی پیدا کرتا ہے۔

بارش کے بارے میں بھی اندازے کیے جاتے ہیں، مگر اس کا ہونا یا نہ ہونا اللہ کے حکم سے ہے۔ کبھی اندازے درست ہوتے ہیں اور کبھی غلط، جس سے یہ سبق ملتا ہے کہ نعمتوں کا فیصلہ کرنے والا اللہ ہے اور اسی پر اعتماد کرنا درست راستہ ہے۔

پھر فرمایا گیا کہ کوئی نفس نہیں جانتا کہ وہ کس زمین پر مرے گا۔ انسان اپنے ٹھکانے اور سفر طے کرتا ہے، مگر موت کی جگہ اس کے علم میں نہیں۔ یہ حقیقت انسان کو غفلت سے جگاتی اور زندگی کو سنوارنے کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

قیامت کے وقت کا علم اللہ نے اپنے پاس رکھا ہے تاکہ انسان ہر وقت جواب دہی کو یاد رکھے اور غفلت میں نہ پڑے۔

یہ پوری حدیث ہمیں سکھاتی ہے کہ کامل اور یقینی علم صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ انسان جتنا بھی جان لے، اس کا علم محدود ہی رہتا ہے۔ جب یہ حقیقت دل میں بیٹھ جاتی ہے تو عاجزی، توکل اور اللہ سے تعلق مضبوط ہوجاتا ہے، اور یہی اس حدیث کی اصل تعلیم ہے۔

فائدہ: جب یہ بات دل میں راسخ ہو جائے کہ غیب کی کنجیاں اللہ کے ہاتھ میں ہیں تو اس کا اثر عملی زندگی میں ظاہر ہونا چاہیے۔ رحمِ مادر میں بچہ ہو تو ماں باپ اللہ ہی کی طرف رجوع کریں اور اس کے صالح، محفوظ، سعادتمند، اور خیر والا ہونے کی دعا کریں۔ بے جا اندیشوں کے بجائے دعا اور توکل کو سہارا بنایا جائے۔

اسی طرح آئندہ کے معاملات میں منصوبہ اور محنت ضرور ہو، مگر دل کا اعتماد اللہ پر رہے۔ بارش مانگنی ہو تو اللہ سے مانگی جائے اور جب نازل ہو تو اسے اللہ کا فضل سمجھا جائے، کسی اور کی طرف منسوب نہ کیا جائے۔ زندگی کے معاملات میں بھی اللہ ہی کو کارساز سمجھا جائے۔ نہ کاہنوں پر اعتماد ہو، نہ قسمت بتانے والوں پر، نہ فال نکالی جائے، کیونکہ یہ سب دل کو اللہ سے دور کرتے ہیں۔ دل کا سکون اسی میں ہے کہ بندہ سادہ اور سیدھے طور پر اپنے رب پر بھروسا رکھے، اسی کی طرف رجوع کرے۔

☆☆☆

فکر ونظر

مغربی تہذیب: تعمیر کے پردہ میں تخریب

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ (سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء)

مغربی تہذیب کی بدولت انسان حیرت انگیز ترقی کرچکا ہے، اور زندگی کے مختلف میدانوں میں لوگوں کا معیار کافی بلند ہو چکا ہے، مغربی تہذیب نے جہاں انسانی زندگی کو سہولتوں اور آسائشوں سے معمور کردیا ہے، اس نے انسان کے مسائل اور دشواریوں کو جن کا وہ صدیوں سے سامنا کر رہا تھا بڑی حد تک حل بھی کردیا ہے، عقل اور علم نے تحقیق کے نئے نئے میدان تلاش کئے ہیں، اور علمی ترقی کے ایسے ذرائع و وسائل انسان کو حاصل ہو گئے ہیں، جن کا پہلے تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس تہذیب نے یونانی اسلامی سرمایہ میں گرانقدر اضافہ کے ذریعہ انسانی معلومات میں غیر معمولی اضافہ کردیا ہے، جس کے نتیجہ میں انسان قدرتی وسائل کے بڑے حصہ پر قابض و حاوی ہو گیا ہے، کسی زمانہ میں اسٹیمر اور بھاپ و پٹرول کی قوت سے چلنے والی سواریوں کی ایجاد حیرت انگیز سمجھی جاتی تھی، لیکن اب ایسی سواریاں وجود میں آچکی ہیں جن کی رفتار آواز کی رفتار سے کہیں زیادہ تیز ہے، میڈیا، ذرائع ابلاغ و مواصلات نے تصور وخیال سے زیادہ ترقی کی ہے، اور ان سے استفادہ اتنا آسان کردیا ہے کہ ہر شخص اس سے مستفید ہو رہا ہے، اس کی وجہ سے مسافتیں ختم ہو گئیں ہیں، اور پوری دنیا ایک گاؤں بن گئی ہے، اس تہذیب نے تنعم وتعیش کے وسائل وذرائع بھی عام کردیئے ہیں، کھانے پینے، رہائش وسائل راحت، اسباب تحفظ اور زندگی کی دوسری مختلف سہولتوں اور آسائشوں کے اسباب مہیا کردیئے ہیں، اور ان کے ذریعہ تفریح وتسلی کے ایسے ایسے سامان وجود میں آچکے ہیں اور ان کا استعمال اتنا عام اور آسان ہو گیا ہے کہ عام لوگ بھی ان سے لطف اندوز ہو رہے ہیں جو پہلے حکام اور امیروں کو بھی میسر نہیں تھے، قابل فکر بات یہ ہے کہ ان وسائل کے جائز وصحیح استعمال کی کوئی حد ہے اور نہ ہی ناجائز اور بیجا استعمال سے روکنے کی کوئی شرط اور نہ اس میں کوئی امتیاز یا پابندی۔

موجودہ تہذیب نے طاقت وقوت کی پیداوار اور انسان کے منافع، مصالح ومفاد میں ان کے استعمال کی صلاحیت کے معیار کو بھی بڑھا دیا ہے، یہ قوت وصلاحیت، زراعت وتجارت، صنعت وحرفت اور میڈیکل سائنس کی تحقیقات میں استعمال کی گئی جس سے انسان کی ضرورت کی چیزوں کی پیداوار میں اور استعمال میں عظیم اضافہ ہوا ہے، ان صلاحیتوں سے موجودہ دور کا انسان فائدہ اٹھا رہا ہے۔

مذکورہ بالا منافع، مصالح اور کوششیں لائق تحسین اور قابل ذکر ہیں لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں اور میدانوں میں تہذیب جدید میں بعض ایسے عناصر پائے جاتے ہیں جو ایک طرف جدید ہیں تو دوسری طرف قدیم۔ مثلاً قدیم یونانی مکتب فکر سے اختلاف کے دعوے کے باوجود اس کے بہت سے اصول و ضوابط، افکار ونظریات کو برابر گلے لگائے ہوئے ہے، عالمی فکر کے باوجود قومی عصبیت اور دین کے علاحدگی کے دعوے کے باوجود مسیحیت سے اس کی وابستگی ناقابل تردید واقع ہے اور اظہار ہوتا رہتا ہے، کالے اور گورے کے درمیان امتیاز وتفریق، گورے کو کالے پر امتیازی تفوق، اس کا بھی مظاہرہ اکثر ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ کھیلوں اور تفریحات میں بھی اس کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے، غلبہ کی ہوس، اسباب و وسائل زندگی سے لطف اندوزی، تسلی وتفریحی سامان کا ضرورت سے زیادہ اہتمام اس کا شعار بن گیا ہے، اس کا ہر مفکر، مصنف، ادیب وانشاء پرداز اپنی فکر ارسطو سے جوڑنے کی کوشش کرتا ہے اور اسے اپنی معاشرت ومعیشت، تعلیم وتربیت اور اخلاق کے جدید نظریات، افکار وخیالات کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

اسی طرح موجودہ مغربی تہذیب کا مسیحیت سے معاشرتی، فکری اور قلبی لگاؤ ہے اور اس میں اس کا انداز سلبی اور معاندانہ ہے۔ حالانکہ وہ دہریت اور الحاد کا دعویدار اور دین کے خلاف بغاوت کا علم بردار۔ نصرانیت کی ایک طرفہ جانبداری کے تمام گوشے اس تہذیب کے دور سیادت وقیادت میں پوری دنیا کے سامنے ظاہر ہو چکے ہیں، اور اس نشر واشاعت، دعوت وتبلیغ کا اہتمام بھی واضح ہو چکا ہے۔ مسیحی مشنریوں پر بے تحاشہ خرچ، افریقہ اور ایشیا کے دور دراز علاقوں کو مسیحیت میں تبدیل کرنے کی چاہت وخواہش دو دو چار کی طرح واضح ہو چکی ہے، اور صلیبی جنگیں جو خود

اس نے چھیڑی تھیں اب تک یورپ کے ہر مفکر کے ذہن پر چھائی ہوئی ہیں۔ غیر مسیحیوں سے انتقامی احساسات و جذبات تجربے کی اس تلخی کو جلا دے رہے ہیں۔ اسلامی ملکوں کے ساتھ اس کے سلوک سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ اسلامی ملکوں کو اپنے دباؤ میں لینے کے لئے اسلامی تحریکوں، تنظیموں کا خاتمہ کرنا، شرعی قوانین کے نفاذ پر پابندی عائد کرنا، اور اسلامی ملکوں میں مسیحیوں کے حق میں کسی قسم کی زیادتی پر حد سے زیادہ تاثر کا اظہار اسی قبیل کی مثالیں اور ثبوت ہیں۔ شخصی آزادی کے دعوے کے باوجود اپنی تہذیبی قدروں کو چاہے وہ عریانی و بے حیائی ہو یا غیر اخلاقی، دوسروں کو اس کا پابند بنانے کا اعلان مغربی ملکوں کے قائدین کرتے رہتے ہیں۔ لسانی عصبیت بھی پوری قوت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ ان تمام باتوں کی روشنی میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آچکی ہے کہ یورپین تہذیب نہ سیکولر مزاج اور نہ ہی خالص علمی یا موضوعی یا ترقی پسند!!

تہذیب جدید کی واضح علامتوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ یورپین ممالک جہاں فرد، جماعت اور انسان کے تحفظ، حقوق کے افکار وخیالات کے نشو ونما ہوئی اور جو انسانی حقوق کے خلاف ہر قسم کی ظلم وزیادتی وخوف وہراس سے بغاوت کے علم بردار ہیں اور اس کی خواہشات و مقاصد، منافع ومصالح کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے دعویدار ہیں، یہ خود اپنے ماتحت قوموں کے ساتھ ہر قسم کا ظلم وستم، زیادتی وناانصافی، سامراجیت وبربریت کا سلوک روا سمجھتے ہیں، اس کی گذشتہ تاریخ اور موجودہ دور میں متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ ان کے نزدیک ان کے مفاد کے لئے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے خون کی کوئی اہمیت نہیں، اور ان پر اپنے مفادات کو تھوپنا چاہتے ہیں، فقر و فاقہ، معیشت کی تنگی و بدحالی و جہالت سے دو چار قوموں کو اپنی سامراجیت و بربریت کا شکار بنا لینے میں ان کو کوئی تردد نہیں ہوتا، ان کے مزاج کو بدلنے، ان کی تاریخ کو مسخ کرنے اور ان کی قومی خصوصیات و تشخصات کا خاتمہ کرنے کے لئے ان کی حکومتیں اور تنظیمیں مسلسل کوشاں ہیں اور اس مقصد کے لیے جو جابر نظام ان ملکوں میں قائم ہے ان کی یہ مغربی ممالک سرپرستی کررہے ہیں۔ ان کے قول وفعل میں تضاد پایا جاتا ہے، وہ اپنے مفاد کے لیے کہیں جمہوریت کے حامی ہیں اور کہیں ڈکٹیٹرشپ کی مدد کرتے ہیں، کہیں مذہبی عناصر کی تائید کرتے ہیں اور کہیں مذہب کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔

موجودہ تہذیب کی واضح علامتوں میں سے یہ بھی ہے کہ علم دوستی، اس کے نشر و اشاعت، آزادیٔ رائے، علمی وفنی سرمایہ کی خدمت کے علم بردار ہونے کے باوجود دوسری قوموں کے علوم و فنون کے سرمایہ کے ساتھ حاقدانہ سامراجیت و بربریت کا معاملہ کرتی ہے۔ لہٰذا ان کے امن و امان اور سلامتی کو تخت و تاراج کردیتی ہے۔ مستشرقین اور ان مغربی محققین کی طرح جنہوں نے عالمی آداب ولسانیات کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے، ان میں دوسرے آداب اور لسانی خصوصیات کو جائز طور پر شامل کرنے اور قومی رسم الخط کی جگہ لاطینی رسم الخط کو نافذ ورائج کرنے، اور کمزور پچھڑی قوموں کا پرانی تہذیب و ثقافت سے رشتہ وناطہ توڑنے کی انتھک کوشش کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس تہذیب کے دور اقتدار اور عہد سامراجیت میں قومیں تباہ وبرباد کردی گئیں، دنیا کے مختلف گوشوں میں علوم وفنون، آداب و لسانیات کا خاتمہ کردیا گیا اور یورپین ممالک نے اپنی تہذیب کو عام کرنے اور رواج دینے کے لیے نئی تاریخ وضع کی جس سے مختلف طبقات میں کشمکش پیدا ہوئی، سفید فام نسل کو تمام قوموں پر تفوق وامتیاز ثابت کرنے کی کوشش کی۔

اس طرح مغربی تہذیب نے جہاں زندگی کی مشکلات، دشواریوں اور کشمکش کو حل کیا وہیں ایسی پریشانیاں اور پیچیدگیاں بھی پیدا کردی ہیں جس کے لیے انسانوں کا خون بہایا جارہا ہے، اور اس وقت دنیا میں جو بھی فساد پھیلا ہوا ہے وہ اسی تہذیب کی دین ہے۔

☆☆☆

بقیہ: تفسیر سورۂ فاتحہ

کبھی اللہ تبارک وتعالیٰ اسباب سے تاثیر سلب کرلیتا ہے اور کبھی اس میں اثر پیدا فرمادیتا ہے۔ ہمارے دادا مولانا حکیم ڈاکٹر عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے، وہ بڑے حکیم، ایم بی بی ایس ڈاکٹر اور عالم ربانی تھے، ایک مریض ان کے پاس آیا، انھوں نے دوا دی، اس کو فائدہ نہیں ہوا، تو ڈاکٹر صاحب نے اس کو قریبی دوسرے ڈاکٹر کے پاس جانے کو کہا، وہ گیا اور اس کو شفا ہوئی، ڈاکٹر صاحب کے پاس وہ دوبارہ آیا اور پرچہ دکھایا تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ یہ وہی دوا ہے جو ہم نے لکھی تھی، اللہ کا اس وقت شفا کا حکم نہیں تھا اور اب اللہ نے اس دوا میں شفا رکھ دی۔

وہ جب چاہتا ہے اسباب میں تاثیر ختم کردیتا ہے اور جب چاہتا ہے تاثیر پیدا فرمادیتا ہے۔ وہی ذات ہے جو "استعانت" کے لائق ہے کہ جس کو جب چاہے دے دے۔

☆☆☆

حق و باطل

مذہب بہ مقابلہ الحاد

(موضوع سے متعلق ایک اہم کتاب کا تعارف)

پروفیسر محسن عثمانی ندوی (دہلی)

اہل علم کو کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے، مذہب اور الحاد کے موضوع پر ابھی جو مناظرہ ہوا اس کی بہت شہرت ہوئی لیکن اس موضوع پر اہم کتابوں کے مطالعہ کی جو فکر ہونی چاہئے وہ نظر نہیں آتی، اس کی وجہ علمی ذوق کی کمی ہے۔

اسلام اور سائنس کے موضوع پر اردو زبان میں جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں دو کتابیں بہت اہم ہیں، ایک کتاب ”علم جدید کا چیلنج“ ہے جو مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء سے پہلی مرتبہ شائع ہوی، جب عربی زبان میں اس کا ترجمہ ”الاسلام يتحدى“ کے نام سے شائع ہوا تو عرب دنیا کے ہر مکتبہ میں یہ کتاب پہنچ گئی، اہل ذوق نے اس کتاب کا والہانہ استقبال کیا، کتاب کے مصنف مولانا وحیدالدین خاں عالمی شہرت کے مالک بن گئے۔ وحیدالدین خاں کے بہت سے نظریات سے اہل علم کو اختلاف ہوسکتا ہے؛ لیکن علم جدید کا چیلنج وہ کتاب ہے جس کی افادیت واہمیت پر سب کا اتفاق ہے اور یہ غیر معمولی اہمیت کی کتاب ہے۔

دوسری کتاب ”مذہب اور سائنس“ مولانا عبدالباری ندوی کی بے حد وقیع تصنیف ہے، اُردو زبان کے دامن میں اسلامیات کے جتنے ہیرے ہیں اور اُردو میں ”اسلام اور سائنس“ کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں ہیں ان میں یہ دونوں کتابیں لعل شب چراغ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس موضوع پر ایک کتاب اور ہے جس کی اپنی اہمیت وافادیت ہے اور وہ ہے ”قرآن اور علم جدید“ یہ کتاب پاکستان سے شائع ہوئی ہے اور کتاب کے مصنف ہیں ڈاکٹر رفیع الدین، یہ کتاب بھی اہل علم کے لیے لائق مطالعہ ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس کتاب کی بہت تعریف کی تھی اور اس کو پڑھ کر مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے جدید فتنۂ ارتداد کے موضوع پر عربی زبان میں ایک کتاب ”ردة ولا أبابكر لها“ کے نام سے لکھی تھی۔

یہ سائنس کا عہد ہے، سائنس کے کرشمات نے اس دور میں تمدن وتہذیب کو جتنا متاثر کیا اور کسی چیز نے نہیں کیا ہے۔ زندگی کا ہر گوشہ اس کی فسوں کاری کے زیر اثر ہے، خلوت گھر اور بازار، سفر اور حضر ہر جگہ اس کا دخل ہے، اس لیے قدرتی طور پر یہ سوال ذہنوں میں آتا ہے کہ یہ سائنس مذہب کی مخالف ہے، یا اس کی طرفدار، وہ مذہب کی تردید کرتی ہے یا اس کی تائید۔ اگرچہ سائنس کے نظریات ہمیشہ تغیر پذیر ہوتے ہیں اور اس کا کوئی قول ہمیشہ کے لیے قول فیصل نہیں، تاہم سائنس کے عہد میں مذہب کا مطالعہ نئے زاویہ نظر سے ضروری ہے اور مذکورہ دونوں کتابوں کی اہمیت یہی ہے کہ دونوں میں سائنسی حقائق کی روشنی میں مذہبی عقیدہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مذہب اور سائنس کے موضوع پر بہت پہلے ڈریپر نے کتاب لکھی تھی جس کا اُردو ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے کیا تھا؛ لیکن وہ پرانی کتاب ہے، اس کے مقابلے میں یہ دونوں کتابیں نئی ہیں اور موضوع کے براہ راست مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔

جس شخص نے ان کتابوں کا مطالعہ کرلیا اس نے اسلام اور سائنس کے موضوع پر اُردو میں اہم ترین کتابوں کا مطالعہ کرلیا

مذہب اور سائنس

اس موضوع پر ’مذہب اور سائنس‘ ایک اہم کتاب ہے جس کے مصنف مولانا عبدالباری ندویؒ ہیں جو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں فلسفہ کے پروفیسر تھے، ان کا شمار عقلی علوم اور مغربی فلسفہ کے بڑے اسکالروں میں کیا جاتا ہے، اگرچہ ان کے پاس ہائی اسکول کی ڈگری بھی نہ تھی، لیکن ان کی بے پناہ صلاحیت کی بنا پر عثمانیہ یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہوا تھا اور وہ بھی فلسفہ کے شعبہ کے صدر کی حیثیت سے۔ ملازمت کے جب مستقل ہونے کا وقت آیا اور کاغذات دستخط کے لیے اعلیٰ حضرت نظام حیدرآباد کے سامنے پیش کیے گئے تو کچھ حسد پیشہ اور کینہ پرور طبیعتوں نے جو ہمیشہ اور ہر جگہ ہوتے ہیں، یہ حقیقت گوش گزار کی کہ جن کو فلسفہ کے شعبے کا صدر بنایا گیا ہے ان کے پاس تو ہائی اسکول کی ڈگری بھی نہیں ہے۔ جب اس کے بارے میں مولانا حبیب الرحمن خان شروانی صدر الصدور مملکت آصفیہ سے سوال کیا گیا تو انھوں نے یہ جواب دیا تھا کہ یہ بات صحیح ہے لیکن کیا کیا جائے کہ فلسفہ ان کے ہاتھ پر ایمان لا چکا ہے اور ثبوت کے طور پر انھوں نے مولا عبدالباری ندویؒ کی کتاب ”مذہب اور عقلیات“ بھجوائی۔ حقیقت یہ کہ تعلیم یافتہ وہ شخص نہیں ہے جو ایک مرتبہ کسی درسگاہ کی ڈگری حاصل کرلے، تعلیم یافتہ وہ شخص

ہے جس کے ہاتھ میں ہمیشہ کتاب ہو اور جس کا مطالعہ غیر منقطع ہو۔ چنانچہ اس دور میں سند یافتہ جاہلوں کی تعداد بڑھ گئی ہے، اب تو حال یہ ہو گیا ہے کہ عالم وفاضل بھی ہیں، استاذ بھی ہیں، لیکن دو سطریں اُردو کی نہیں لکھ سکتے، جو مادری زبان ہے، مولانا عبد الماجد دریابادیؒ نے مولانا عبدالباریؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''وہ فلسفی سے ترقی کر کے متکلم اور صوفی بن گئے؛ لیکن عقلیت جیسے ان کی سرشت میں تھی، باوجود اپنے تقشف اور تصلب کے وہ محض تسبیح اور سجادہ کے صوفی ہو کر نہیں رہے؛ بلکہ بقدر ضرورت مغربی فلسفہ اور اس سے بھی بڑھ کر ماڈرن سائنس خصوصاً شعبۂ طبیعیات سے ان کا ربط اور ان کا مطالعہ قائم رہا، مذہب اور سائنس ان کی بے حد اہم کتاب ہے، کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر رضی الدین نے لکھا ہے جو پہلے عثمانیہ یونیورسٹی میں ریاضی کے استاد اور بعد میں پشاور یونیورسٹی کے اور پھر اسلام آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے اور جن کا نام نوبل پرائز کے لیے بھی پیش کیا گیا تھا۔ انھوں نے اس کتاب کی بہت تعریف کی ہے ''قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری''۔

مولانا عبدالباری ندوی نے ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی تھی، جہاں علامہ شبلی کی رہنمائی اور سرپرستی نے طلبہ کے اندر علمی کتابوں کے مطالعے کا شوق اور عربی اور اردو انشا پردازی کا ذوق پیدا کر دیا تھا اور ندوۃ العلماء کو اس اعتبار خاص سے ہندوستان کی دوسری تمام دینی درسگاہوں پر امتیاز حاصل ہے۔ ندوۃ العلماء وہ دانش گاہ تھی جہاں پڑھ کر اور جہاں کے ماحول میں رہ کر طلبہ وسیع المطالعہ ادیب اور مصنف بن جاتے تھے، فارغین ندوہ سے ادب اور اسلامی علوم کا فلک مطلع انوار بن گیا۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ بحیثیت مجموعی ندوۃ العلماء کے فرزندوں کی علمی یادگار ہے۔ علامہ شبلی ندوہ میں طلبہ پر بہت شفقت کرتے اور ان کی علمی رہنمائی کرتے تھے اور ان کی ضرورتوں کا اولاد سے بڑھ کر خیال رکھتے تھے، ان کی گفتگو کا موضوع ہمیشہ علمی ہوتا تھا اور وہ اسی انداز سے طلبہ کی علمی تربیت کرتے تھے، ان کی شخصیت اس پارس پتھر کی طرح تھی کہ جو اس سے مس کرتا وہ کندن بن جاتا۔ ان کی شخصیت نسیم بہار کی طرح تھی، اس کا جھونکا جس کلی کو چھوتا وہ کلی گلِ شگفتہ اور گلِ سرسبد بن جاتی، ان کی شخصیت روشن چراغ کی طرح تھی، جس کی لو سے کئی چراغ جل اُٹھتے ہیں اور پھر شبستان غم میں چراغاں کا منظر سامنے آجاتا ہے، شبلی علم وادب کی دنیا میں ایک نظام شمسی کا نام ہے جو کئی سیاروں پر مشتمل ہے اور اس کے ایک سیارہ کا نام عبدالباری ندوی ہے۔ علامہ شبلی نے مولانا عبدالباری کے انگریزی اور فلسفہ کے ذوق کو دیکھ کر ان کی اس میدان میں تعلیم کا انتظام کیا اور ان کے لیے علی گڑھ خطوط لکھے، اس طرح مولانا عبدالباری نے انگریزی کی استعداد بہم پہنچائی اور جدید فلسفہ میں ڈی کارٹ سے لے کر ہیوم اور برکلے سب کو پڑھ ڈالا، پھر انھوں نے برکلے کی کتاب (Principles of Human Knowledge) کا اُردو ترجمہ ''مبادیٔ علم انسانی'' کے نام سے کیا اور برکلے کی سوانح اور اس کے فلسفے پر کتاب بھی لکھی۔ یہ دونوں کتابیں علامہ شبلی کے قائم کردہ ادارہ دارالمصنفین سے شائع ہوئیں۔ کاش دینی مدارس کے طلبہ کا آج یہ مزاج بن سکتا۔

مولانا عبدالباری ندوی کی یہ کتاب ''مذہب اور سائنس''، علم کلام اور سائنس کے اثرات پر ایک نئے نقطۂ نظر سے بحث کرتی ہے اور فلسفہ اور سائنس کی جدید تحقیقات کی روشنی میں قرآنی حقائق کا اثبات کرتی ہے۔ کتاب کے بارے میں مشہور سائنٹسٹ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''جب مادیت اور دہریت کے پرستاروں کا وہ طلسم جو انھوں نے سائنس کی بنیادوں پر قائم کیا تھا ٹوٹ گیا تو پھر کائنات کی حقیقت پر غور وفکر کرنے والوں کے لیے بمصداق ''کافر نتوانی شدنا چار مسلمان شو'' خدا کی ہستی پر ایمان لانے کے لیے نئی راہیں کھل گئیں اور کم از کم ایک ہمہ گیر آفاقی ذہن (Uriversal Mind) کو تسلیم کرنا ناگزیر ہو گیا۔ حضرت مولانا عبدالباری نے اس حقیقت کو اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور ان اصحاب کے لیے جو سائنس اور ٹکنالوجی کی حالیہ غیر معمولی ترقی سے مرعوب اور متاثر ہو کر ایمان کی کمزوری کا شکار ہو رہے ہیں، یقین محکم حاصل کرنے اور دنیا وآخرت میں نجات پانے کا سامان مہیا کیا ہے۔''

ہم جس کائنات میں رہتے ہیں اس کو سمجھنا بھی آسان نہیں، یہ جہاں عجب جہاں ہے جس کی محیر العقول وسعت وعظمت، ذہن کو حیران کر دیتی ہے، اس کے حدود حد ادراک سے ماورا ہیں۔ مولانا عبدالباری ندوی اپنی اس کتاب میں لکھتے ہیں:

''ایک طرف صرف ایک سورج کے مقابلہ میں ہماری مٹر برابر زمین کا خیال کرو اور دوسری طرف اس ایک سورج جیسے کروڑوں دوسرے سورجوں کا جو اس مجموعہ میں پائے جاتے ہیں، جس کو کہکشانی نظام کہا جاتا ہے خیال کرو، پھر یہ کائنات یا عالم اس کہکشانی نظام پر ختم نہیں ہو جاتا؛ بلکہ اس جیسے لاکھوں لاکھ سحابے خلا میں تیر

رہے ہیں اور ہم سے قریب ترین سحابہ بھی چھ کڑور اڑسٹھ ہزار نواسی نوری سال (Light Years) کی دوری پر واقع ہے۔ اندازہ لگایئے دور ترین سحابہ کہاں ہوگا۔

روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہے، اس کے باوجود جب ہم سورج کو دیکھتے ہیں تو وہ آٹھ منٹ پہلے کا سورج ہوتا ہے، اسی طرح جس قریب ترین ستارہ کو ہم دیکھتے ہیں وہ چار سال پہلے کا ہوتا ہے۔ پانی کے ایک قطرہ میں لاکھوں بلکہ اربوں کھربوں سالمات پائے جاتے ہیں، پھر اس سالمہ کے اندر اس سے بھی بہت چھوٹے چھوٹے الکٹران یا برقی ذرات پائے جاتے ہیں جن کے مابین ایسے ہی فاصلے پائے جاتے ہیں، جیسے آفتاب اور اس کے سیاروں کے درمیان ہوتے ہیں۔ اس کائنات کی حقیقتیں ذہن کو چکر دینے والی اور دماغ کو بوکھلا دینے والی ہیں، اس کائنات کے طلسم کے آگے طلسم ہوش ربا بھی ہیچ ہے؛ بلکہ اس سے بڑھ کر کوئی اور طلسم ہوش ربا نہیں، یہ کائنات اسرار کا مجموعہ ہے، انسان اسرار پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے، انسان ذرہ ذرہ کا جگر چاک کرنے اور نامعلوم کو معلوم بنانے کی کوشش کرتا ہے، مگر یہ چشم حیراں ہے کہ اس کی حیرانی بڑھتی جاتی ہے۔ اس دنیا میں ترقی یافتہ ملکوں نے نظام شمسی کے صرف ایک چاند تک اپنی کمند پھینکی ہے اور سیارہ مریخ کے بارے میں کچھ قیاسی باتیں حاصل ہوئی ہیں؛ لیکن اس نظام شمسی کے ماوراء ہزاروں لاکھوں نظام شمسی کہکشاں اور سحابے موجود ہیں، اس کائنات پر غیب کے جو پردے پڑے ہوئے ہیں انسان ان کے جاننے کا خواہشمند ہوتا ہے؛ لیکن کائنات کا غیب ہی ابھی تک لامعلوم ہے اور جو اس کائنات سے ماوراء کائنات ہے اور جو دوسری دنیا ہے اس کے جاننے کا اور کوئی ذریعہ نہیں، سوائے اس کے کہ ہم پیغمبر کی بات پر ایمان لائیں۔ وہ جو انسانوں کی اور تمام مخلوقات کی جسمانی پرورش کرتا ہے اس سے بعید تر یہ بات ہے کہ انسانوں کو پیدا کرنے والے سے اور پیدا کرنے کے مقصد سے اور کائنات کے انجام سے بے خبر رکھے اور عقل سے بعید تر یہ بات بھی ہے کہ انسان اپنے مقصد تخلیق کو اور پیدا کرنے والے کو جاننے کی کوشش نہ کرے۔ یہ کائنات ایک کہنہ کتاب ہے، جس کے اوّل وآخر کے اوراق ندارد ہیں۔ اس کتاب کے مصنف (اللہ تعالیٰ) اور زمانۂ تصنیف اور مقصد تصنیف اور پیغام تصنیف کو جاننے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان کھوج میں لگا رہے اور ظن وتخمین سے کام لے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مصنف کتاب یعنی اللہ کی طرف سے ہر زمانے میں جو رسول بھیجے گئے ہیں اور ان رسولوں پر جو کتاب بھیجی گئی ہے ان پر ایمان لائے۔ مذکورہ بالا موضوع بہت زیادہ اہم اس لئے ہے کہ ہر پیغمبر نے اپنے اپنے زمانہ میں عقیدہ کے بگاڑ پر نکیر کی ہے موجودہ زمانہ میں جو شخص توحید کی دعوت دینے کے لئے اور عقیدہ کے بگاڑ کو ختم کرنے کی لئے اور پیغمبرانہ مشن کے احیاء کے لئے کھڑا ہوگا اسے لازمی طور پر جدید الحاد کو بھی ختم کرنے کے لئے کھڑا ہونا ہوگا اس کا دوسرا نشانہ تثلیث ہوگا اور اس کا تیسرا نشانہ بت پرستی اور شرک ہندوستان جس کا سب سے بڑا قلعہ ہے، اصل پیغمبرانہ کام وہ نہیں ہے جو آج مختلف جماعتیں اور تنظیمیں انجام دے رہی ہیں یہ سب مجبوروں معذوروں مقہوروں کی تنظیمیں ہیں ۔

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ ورسم شاہبازی

☆☆☆

نصرتِ الٰہی اور توفیق ربانی

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی

آج مغربی انسان، قلبی سکون واطمینان کی تلاش میں عقیدے اور ایمان کے راستے کی طرف لوٹ رہا ہے، جہاں اُسے اپنی متاعِ گم شدہ کی بازیابی اور اس کو دل کا سکون ملتا ہے اور وہ دل کی گہرائیوں سے اللہ کی حمد وثنا کے ترانے گاتا ہے کہ اللہ نے اُسے زندگی کی خوش بختی، حقائق اور اصل مقصد تخلیق کی معرفت کا زریں موقع عنایت فرمایا کہ وہ میری بندگی کریں۔ خداوند قدوس نے اس کو محرومی سے سعادت کی طرف اور تاریکیوں سے نور کی طرف نکال کر کتنا بہرہ ور فرمایا، خیر وشر، معروف ومنکر کی تمیز دے کر اُسے کس قدر اعزاز بخشا، برائیوں سے نکال کر اچھائیوں کی طرف اور مادیت کی باغیانہ روش سے نکال کر امن وعافیت کے دامن میں لا پہنچایا اور ذکرِ الٰہی پر اعتماد اور فرائض وواجبات کی ادائیگی کا بہترین موقع عطا فرمایا، وہ موقع زندگی میں خوشگواری، وقت میں برکت وکامیابی اور مصائب وامراض کے ازالہ کا ضامن ہے، اس کی بنیاد پر انسان اپنے رب کا محبوب بن جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ ہی اس کا نگراں، محافظ، حامی وناصر ہوجاتا ہے، پھر اُسے نہ کسی قسم کا خوف دامن گیر ہوتا ہے اور نہ غم واندیشہ، نہ پشیمانی اُسے لاحق ہوتی ہے اور نہ اکتاہٹ وآزردگی، یہی نصرت الٰہی اور توفیق ربانی ہے جس سے ہر لحہ وہ فیض یاب ہوتا رہتا ہے۔ ☆☆☆

دعوت واصلاح

نیا سال: نئے عزائم اور نئے حوصلے

ڈاکٹر سراج الدین ندوی (مدیر ماہنامہ ’اچھا ساتھی‘ بجنور)

وقت انسانی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ وہ عظیم نعمت ہے جس کا ایک لمحہ بھی گزر جانے کے بعد واپس نہیں آتا۔ انسان کی کامیابی یا ناکامی کا بڑا دارومدار اسی بات پر ہوتا ہے کہ وہ وقت کو کس طرح استعمال کرتا ہے؟ آج سال کا آخری دن ہے۔سال کا اختتام اور نئے سال کا آغاز دراصل اسی وقت کی گردش کا ایک نمایاں پڑاؤ ہے، جہاں انسان کو رک کر اپنے ماضی کا جائزہ لینے، حال کو سمجھنے اور مستقبل کے لیے سمت متعین کرنے کا موقع ملتا ہے۔ نیا سال محض کیلنڈر کی ایک نئی تاریخ نہیں بلکہ یہ احتساب، اصلاح اور تجدیدِ عہد کی تاریخ ہے۔ یہ دن ہے ایک نئی تاریخ لکھنے کا عزم کرنا کا ،ایک رات ہے اپنے سال بھر کی کوتاہیوں پر رب غفور سے مغفرت طلب کرنے کی۔ جب ہم گزرے ہوئے سال کے اوراق پلٹتے ہیں تو ہمیں کامیابیوں کے ساتھ ساتھ ناکامیوں، امیدوں کے ساتھ مایوسیوں اور کوششوں کے ساتھ کوتاہیوں کی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے۔ انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہم نے وقت کے تقاضوں کو پوری طرح نہیں سمجھا اور نہ ہی اپنی ذمہ داریوں کو اس سنجیدگی سے نبھایا جس کے ہم دعوے دار ہیں۔ یہی خود احتسابی کسی بھی مثبت تبدیلی کی پہلی سیڑھی ہے۔

سن 2025 ملک وملت دونوں کے لیے کئی حوالوں سے غیر معمولی رہا۔ عالمی سطح پر سیاسی کشمکش، معاشی عدم استحکام، ماحولیاتی بحران اور اخلاقی زوال نے انسانی سماج کو گہرے اضطراب میں مبتلا رکھا۔ فلسطین میں ظلم کی انتہاء ہوگئی، روس اور یوکرین نے تباہیوں نے نئے ابواب رقم کیے، شام سے ایک ظالم وجابر فرمانروا کو بھاگنے پر مجبور کیا گیا۔ ہمارے ملک میں بھی سماجی تناؤ، معاشی دباؤ، بے روزگاری، تعلیمی مسائل اور اخلاقی قدروں کی کمزوری جیسے مسائل شدت کے ساتھ سامنے آئے۔ لنچنگ جاری رہی ،نفرت انگیز اور انسانوں کو تقسیم کرنے والے بیانات کا تسلسل باقی رہا، بے روزگاروں کی تعداد میں اضافہ ہوا، ملک چھوڑ کر جانے والوں کی تعداد بھی بیس لاکھ تک پہنچ گئی۔ ان حالات نے یہ واضح کر دیا کہ ترقی محض نعروں سے نہیں بلکہ سنجیدہ منصوبہ بندی اور مسلسل محنت سے حاصل ہوتی ہے۔

مسلمانانِ ہند کے لیے یہ سال خاص طور پر فکرمندی کا باعث رہا۔ ایک طرف ہمیں تعلیمی اور معاشی پسماندگی کا سامنا رہا تو دوسری طرف داخلی انتشار، باہمی اختلافات اور غیر ضروری جذباتیت نے ہمارے مسائل کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔ بہت کم مواقع پر ہم نے ٹھنڈے دل ودماغ سے حالات کا تجزیہ کیا اور طویل المدتی حکمتِ عملی کے بجائے وقتی ردِعمل کو ترجیح دی، جس کا نقصان بالآخر ہمیں ہی اٹھانا پڑا۔

اگر گزشتہ سال کے حالات کو محض تاثرات کے بجائے عقلی اور عملی پیمانے پر دیکھا جائے تو کئی تلخ حقائق سامنے آتے ہیں۔ مختلف ریاستوں کے تعلیمی نتائج اور مسابقتی امتحانات کے مشاہدے سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی نمائندگی اعلیٰ تعلیمی اداروں اور پیشہ ورانہ شعبوں میں اگرچہ بہتر ہوئی ہے لیکن اب بھی محدود ہے۔ اسکولی سطح پر ترکِ تعلیم کی شرح، کیریئر رہنمائی کی کمی اور تعلیمی ترجیحات کے فقدان نے ہماری نئی نسل کو نقصان پہنچایا ہے۔

اسی طرح بعض حساس مواقع پر مسلمانوں کا اجتماعی ردِعمل زیادہ تر جذباتی رہا، خاص طور پر ماہ ربیع الاول میں آئی لو محمد کو لے کر مسلمان عمل کے بجائے جذبات کی رو میں بہتے نظر آئے۔ کئی جگہ قانونی اور آئینی دائرے میں رہ کر بات رکھنے کے بجائے غیر منظم احتجاج یا غیر محتاط بیانات سامنے آئے، جس سے مسئلہ حل ہونے کے بجائے مزید الجھ گیا۔ یہ حقیقت اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے پاس جذبہ تو موجود ہے، مگر اسے حکمت، قانون اور منصوبہ بندی کے ساتھ استعمال کرنے کا منظم نظام کمزور ہے۔

معاشی میدان میں بھی گزشتہ سال نے ہمیں آئینہ دکھایا۔ مہنگائی اور بے روزگاری نے پورے ملک کو متاثر کیا، مگر مسلمان اس لیے زیادہ متاثر ہوئے کہ ہماری بڑی آبادی غیر منظم شعبوں، چھوٹے کاروبار اور روزمرہ کی مزدوری سے وابستہ ہے۔ اس کے باوجود اجتماعی سطح پر جدید ہنر، اسکل ڈیولپمنٹ اور معاشی تنوع پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ یہ ایک عقلی حقیقت ہے کہ جب معاشی بنیاد کمزور ہو تو سماجی وقار اور خود اعتمادی بھی متزلزل رہتی ہے۔

اگر ہم دیانت داری سے جائزہ لیں تو یہ حقیقت تلخ ضرور ہے مگر ناقابلِ انکار ہے کہ ہماری بہت سی مشکلات کی جڑیں ہمارے اپنے طرزِ عمل میں پیوست ہیں۔ ہم نے تعلیم کو محض ڈگری حاصل کرنے تک محدود کر دیا، حالانکہ تعلیم کا اصل مقصد شعور، کردار اور صلاحیت کی تعمیر ہے۔ ہم نے اخلاق کو تقریروں اور تحریروں تک محدود رکھا اور عملی زندگی میں اس کی جھلک کم ہی دکھائی دی۔

بطور شہری بھی ہم سے کوتاہیاں ہوئیں۔قانون کی پاسداری، نظم وضبط، صفائی، قومی یکجہتی اور سماجی ذمہ داری جیسے بنیادی امور کو ہم نے اکثر نظر انداز کیا۔ہم حقوق کی بات تو پورے جوش سے کرتے ہیں مگر فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی برتتے ہیں، حالانکہ ایک مضبوط قوم کی بنیاد ذمہ دار شہریوں پر ہی قائم ہوتی ہے۔

نیا سال ہمیں یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ ہم مایوسی کے بوجھ کو اتار پھینکیں اور امید، حوصلے اور عزم کے ساتھ نئے سفر کا آغاز کریں۔تاریخ گواہ ہے کہ وہی قومیں آگے بڑھتی ہیں جو اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتی ہیں اور انہیں درست کرنے کے لیے عملی اقدامات اٹھاتی ہیں۔نیا سال محض نعرہ نہیں بلکہ عمل کا مطالبہ کرتا ہے۔سب سے پہلے ہمیں انفرادی اصلاح کی طرف توجہ دینی ہوگی۔ ہر شخص اگر اپنے دائرہ اختیار میں ایمانداری، محنت، دیانت اور ذمہ داری کو شعار بنالے تو مجموعی صورتِ حال میں مثبت تبدیلی ناگزیر ہے۔فرد کی اصلاح ہی معاشرے کی اصلاح کی بنیاد بنتی ہے۔

نئے سال کے لیے سب سے اہم اور فیصلہ کن منصوبہ تعلیم کو بنانا ہوگا۔یہ تعلیم صرف رسمی نصاب یا امتحان پاس کرنے تک محدود نہ ہو بلکہ فکری، اخلاقی اور عملی تربیت کا جامع نظام ہو۔ہمیں اپنی نئی نسل کو محض روزگار کا طلب گار نہیں بلکہ سماج کا ذمہ دار معمار بنانا ہے۔دینی شعور کے ساتھ ساتھ سائنس، ٹیکنالوجی، زبان، قانون اور سماجی علوم میں مہارت وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔کوئی بھی قوم صرف معاشی یا سائنسی ترقی سے عظیم نہیں بنتی بلکہ اخلاقی اقدار ہی اسے پائیدار عظمت عطا کرتی ہیں۔سچائی، امانت، عدل، صبر، برداشت اور خدمتِ خلق جیسے اوصاف کو ہمیں اپنی اجتماعی زندگی کا حصہ بنانا ہوگا۔نئے سال کا یہ عہد ہونا چاہیے کہ ہم قول و فعل کے تضاد کو کم سے کم کریں گے۔ملتِ اسلامیہ کی ایک بڑی کمزوری باہمی انتشار ہے۔مسلکی، لسانی اور تنظیمی اختلافات کو ہوا دینے کے بجائے مشترکہ نکات پر جمع ہونا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔سال گزشتہ میں بھی کئی اشتہار اس طرح کے نظر آئے جس سے مسلکی عناد کی بو آئی۔اختلاف رائے کا حق اپنی جگہ، مگر اختلاف کو تصادم میں بدل دینا دانش مندی نہیں۔گزشتہ سال نے یہ سبق واضح کر دیا کہ منتشر آواز مؤثر نہیں ہوتی۔

یہ ملک ہم سب کا مشترکہ گھر ہے۔اس کی ترقی، استحکام اور امن میں ہر شہری کا حصہ ہے۔نئے سال میں ہمیں یہ عہد کرنا ہوگا کہ ہم نفرت کے بجائے محبت، تعصب کے بجائے انصاف اور انتشار کے بجائے تعاون کو فروغ دیں گے۔ایک مضبوط اور خوش حال ہندوستان تبھی ممکن ہے جب اس کے تمام شہری ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کریں اور مل جل کر آگے بڑھیں۔

ملک وملت کا مستقبل نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے۔اگر نوجوان مایوسی، بے مقصدیت اور منفی رجحانات کا شکار ہو جائیں تو قوم کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔نئے سال میں ضروری ہے کہ ہم نوجوانوں کو تعلیم، ہنر، اخلاق، قانونی شعور اور خود اعتمادی سے آراستہ کریں تاکہ وہ جذبات کے بجائے شعور کے ساتھ آگے بڑھ سکیں۔

میرے عزیزو! نیا سال ہمیں صرف مبارک بادوں اور رسمی تقریبات کا موقع نہیں دیتا بلکہ یہ ہم سے سنجیدہ عمل، واضح منصوبہ بندی اور مسلسل محنت کا مطالبہ کرتا ہے۔اگر ہم نے گزرے ہوئے سال کی غلطیوں سے سبق سیکھ لیا اور نئے سال میں خلوص، دانش اور حکمت کے ساتھ آگے بڑھے تو یقیناً حالات بدل سکتے ہیں۔آیئے، اس نئے سال کا استقبال نئے عزائم، نئے حوصلوں اور نئی منصوبہ بندی کے ساتھ کریں۔انفرادی اصلاح سے اجتماعی فلاح تک کا سفر طے کریں اور اپنے عمل سے ثابت کریں کہ ہم اس ملک کے ذمہ دار شہری اور اپنی ملت کے سچے خیر خواہ ہیں۔یہی طرزِ فکر ہمیں ایک روشن، مضبوط اور باوقار مستقبل کی طرف لے جا سکتا ہے۔

☆☆☆

وقت کی نہایت اہم ضرورت

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

مسلمانوں کے زیر انتظام عصری مدارس کی ایک بڑی ضرورت نصابِ تعلیم میں ایسے مضامین کو شامل کرنا ہے، جو مسلمان طلبہ اور طالبات کو اسلام کے بارے میں واقفیت بھی فراہم کریں اور اُن کو احساس کمتری میں مبتلا ہونے سے بچائیں محض چند دُعاؤں کا یاد دلا دینا کافی نہیں؛ بلکہ توحید، شرک، رسالت، عبادات، معاشرتی زندگی اور معاملات کے بارے میں ان کو معلومات فراہم کی جائیں، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلامی تاریخ کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہیں، ان کے متعلق وہ حقائق سے آگاہ ہوں، ہندوستان کی حقیقی تاریخ کہ مسلمانوں نے اس ملک کو کیا کچھ دیا؟ پڑھائی جائے، مسلم حکمرانوں کے بارے میں جو پروپیگنڈے کیے جاتے ہیں، ان کی حقیقت سمجھائی جائے؛ تاکہ آج از سر نو تاریخ لکھنے کی جو کوشش کی جارہی ہے، اس کے زہر سے مسلم نوجوانوں کے ذہن کو محفوظ رکھا جاسکے، یہ وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے، جن جماعتوں میں بورڈ کا امتحان دینا ہوتا ہے، ان جماعتوں کو چھوڑ کر دوسری کلاسس میں ایسی کتابیں رکھی جائیں تو شاید اس میں کوئی دقت نہ ہو۔ ☆☆

ایمان وعمل

مبلغ افسر کی داستانِ حیات

(احسن ظہیر علوی رحمۃ اللہ علیہ)

جناب شارق علوی (لکھنؤ)

سورج آہستہ آہستہ رات کی آغوش میں جانے کے لیے گامزن تھا، درختوں پر پرندے شوروغل مچا رہے تھے، شاید رات میں اپنے بسیرے کی تلاش میں تھے، قبرستان کے وسیع میدان میں ایک قبر تیار کی جارہی تھی اور قریب میں سفید کفن میں لپٹی لاش زمین دوز ہونے کے لیے تیار تھی، یہ وہ ہستی تھی جو ایسے موقعوں پر جنازے کے ساتھ آتے ہوئے لوگوں کو اپنے مخصوص انداز میں ایک مؤثر خطاب کے ذریعہ عذاب قبر اور دوزخ و جنت کی تصویر کشی کرتا تھا، سامعین کو آگاہ کرتا تھا کہ تم سب کو ایک دن یہ دیکھنا ہوگا، اس لیے اپنے اعمال درست کرو، زندگی اللہ اور رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی کوشش کرو، افسوس آج وہ خود بے زبان ہوکر اپنے آخری سفر پر رخصت ہورہا تھا، قبر تیار ہوگئی اور کلمہ و درود کے ساتھ تدفین عمل میں آئی، جنازہ کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں نے آخری دعا پڑھی اور منتشر ہوگئے۔

مغرب کی اذان ہورہی تھی، اسے سن کر میں مسجد میں داخل ہوگیا، نماز ادا کی اور مسجد کے ایک کونے میں سنت و نفل پڑھنے کے لیے رک گیا، نماز ختم ہوئی تو میں اپنی ہی جگہ پر بیٹھے بیٹھے متوفی کی گزشتہ زندگی کے بارے میں سوچنے لگا اور سارے حالات میرے دماغ میں ایک فلم کی طرح چلنے لگے:

تعلیمی دور ختم ہونے کے بعد انھوں نے مرکزی حکومت کے تحت سنٹرل اکسائز میں ملازمت غالباً ۱۹۴۵ میں شروع کی تھی، ان کی پہلی تعیناتی دہلی میں ہوئی تھی جہاں یہ افسری ٹھاٹ باٹ سے رہ رہے تھے، داڑھی مونچھوں سے مبرا، کلین شیو، انگریزی پہناوا اور رہن سہن کا طریقہ بھی بالکل ماڈرن!

دو تین ماہ کے بعد ان کو ایک دوست نظام الدین میں تبلیغی جماعت کے مرکز لے گئے، جماعت کے سربراہ مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ سے ملاقات کرائی، پہلی ہی ملاقات میں یہ ان سے اتنا متاثر ہوگئے کہ ہر جمعرات کو مغرب اور عشاء کے درمیان ہونے والے درس میں شریک ہونے لگے، مختصر عرصہ میں تبدیلی کے آثار نمودار ہونا شروع ہوگئے، داڑھی بڑھ گئی، پہناوے میں تبدیلی شروع ہوگئی، کوٹ پتلون کے بجائے کرتا پائجامہ اور شیروانی نے لے لی۔

ملک کی تقسیم کی باتیں ۱۹۴۷ء کے شروع میں ہی چل پڑی تھیں اور فرقہ وارانہ کشیدگی بھی بڑھ گئی تھی، اتفاق سے ان کا تبادلہ اتر پردیش میں ہوگیا اور گونڈہ میں انہوں نے اپنا عہدہ سنبھالا، یہاں سرکاری فرائض کی انجام دہی کے بعد جو وقت ملتا، اس میں انہوں نے دعوت وتبلیغ کا کام بھی جاری رکھا، اگست ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا اور پورے ملک میں انتشاری حالات پیدا ہو گئے، غیر مسلموں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھر آیا، بہرحال اسی پراگندہ صورت میں وقت گزرتا جارہا تھا، ادھر یہ افسر روز صبح محلہ کے سبھی نوجوان کے گھر کی کنڈیاں کھٹکھٹانے لگے اور انہیں فجر کی نماز کے لیے مسجد میں آنے کی ترغیب دینے لگے، فجر کی نماز کے بعد درس بھی ہوتا تھا اور ملک میں امن وامان کے لیے دعائیں مانگی جاتی تھیں، مقامی پولیس نے ان پر نظر رکھنی شروع کی اور بالآخر یہ رپورٹ حکومت کو بھیجی کہ یہ افسر روز صبح مسلمانوں کو اکٹھا کر کے مسجد میں ملک دشمن تقریر کرتے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ میں ہی حکومت سے ان کی فوراً برخاستگی کے احکام جاری ہوگئے اور یہ اپنے عہدہ سے برطرف کر دیے گئے، اور اس کو اللہ کی طرف سے دی گئی بہبودی سمجھتے ہوئے اپنا مختصر سامان لے کر لکھنؤ آگئے اور دعوت وتبلیغ کے کام میں منہمک ہوگئے۔

ان کے والد ایک اثر دار نیشنلسٹ اور مشہور طبیب تھے، انہوں نے اپنے اثر ورسوخ سے محکمہ کے وزیر مہابیر تیاگی سے رابطہ قائم کر کے انہیں صورتحال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ وہ ملک دشمن نہیں بلکہ وہ ملک میں امن وامان اور خوشحالی کے لیے دعائیں مانگتے تھے۔ وزیر نے ان سے اپیل منگوائی اور برخاستگی کے حکم کو منسوخ کر کے بحالی کے احکام جاری کر دیے، اس طرح پھر یہ اپنے عہدہ پر تعینات ہوگئے لیکن ان کی تبلیغی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔

اپنے کام میں اعلیٰ معیار اور ایمانداری کی بدولت یہ ترقی کے مدارج طے کرتے رہے اور بالآخر کلکٹر سینٹرل ایکسائز کے عہدہ سے وقت مقررہ پر ملازمت سے باعزت سبکدوش ہوئے اور اب پوری طرح تبلیغی کام میں لگ گئے۔

(باقی صفحہ نمبر ۱۸ر پر)

تاریخ ہند

آر ایس ایس کی تعلیمی کاوشیں اور مسلمان

ڈاکٹر محمد سعود اعظمی ندوی (لکھنؤ)

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی صورتِ حال مجموعی طور پر کمزور اور غیر منظم ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کی آبادی ملک کی کل آبادی کا تقریباً چودہ فیصد ہے، لیکن تعلیمی میدان میں ان کا حصہ نہایت کم اور تشویش ناک ہے۔

مسلمانوں کے پاس آج بھی کالجوں اور یونیورسٹیوں کی بہت قلیل تعداد ہے۔ بیشتر دینی ادارے۔جنہیں مدارس یا اسلامی اسکول کہا جاتا ہے۔صرف مذہبی تعلیم تک محدود ہیں اور عصری مضامین میں بہت پیچھے ہیں۔

چند جدید اسلامی اسکول یا کالج ضرور قائم ہیں، مگر وہ بھی مالی وسائل کی کمی، تربیت یافتہ اساتذہ کی قلت، اور تنظیمی کمزوری کے باعث نمایاں کردار ادا نہیں کر پاتے۔ مسلمانوں کے لیے قابلِ ذکر چند ادارے جیسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) ہیں، مگر ان میں داخلے کی گنجائش بہت محدود ہے، جو ملک بھر کے کروڑوں مسلم طلبہ کے لیے ناکافی ہے۔

اعداد و شمار کے مطابق، بعض ریاستوں میں مسلم طلبہ کی اعلیٰ تعلیم میں شمولیت صرف تین سے پانچ فیصد کے درمیان ہے، جو قومی اوسط سے کہیں کم ہے۔ دوسری طرف، ناخواندگی کی شرح بعض مسلم اکثریتی علاقوں میں اب بھی زیادہ ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ بہت سے والدین تعلیم کو ترجیح نہیں دیتے، بلکہ غربت یا روزگار کے دباؤ کے باعث بچوں کو جلد ہی کام پر لگا دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم۔ جو دراصل مسلمانوں کی حالت بدلنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ اُن کے لیے ثانوی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

اس کے برعکس، راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (RSS) نے تعلیم کو اپنی نظریاتی اور تنظیمی حکمتِ عملی کا مرکز بنایا ہے۔ 1925ء میں قائم ہونے والی یہ تنظیم برسوں سے اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ نسلوں پر فکری کنٹرول حاصل کرنے کا بہترین راستہ تعلیم ہے۔ اسی سوچ کے تحت RSS نے اسکولوں، کالجوں، تربیتی اداروں اور یونیورسٹیوں کا ایک وسیع جال بچھا رکھا ہے۔ اس کا تعلیمی وِنگ ودیا بھارتی (Vidya Bharati) آج پورے ملک میں 13 ہزار سے زائد اسکول چلا رہا ہے، جن میں تقریباً تین کروڑ طلبہ زیرِ تعلیم ہیں۔ اس کے علاوہ 120 سے زیادہ کالج اور تربیتی مراکز اور ہزاروں دیہی اسکول ایکل ودیالیہ (Ekal Vidyalaya) کے نام سے چلائے جا رہے ہیں۔ مجموعی طور پر RSS اور اس کے تعلیمی ادارے ہر سال تعلیم پر تقریباً دس ہزار کروڑ روپے (یعنی 2.1 بلین امریکی ڈالر) سے زیادہ خرچ کرتے ہیں۔

یہ اعداد و شمار اسے ایشیا کی سب سے بڑی غیر سرکاری تعلیمی نیٹ ورک میں شامل کرتے ہیں۔

RSS کی تعلیمی حکمتِ عملی کی سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ اس نے تعلیم کو صرف علم حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں سمجھا، بلکہ اسے سماجی و سیاسی اثر و رسوخ بڑھانے کا ہتھیار بنایا۔

یہی وجہ ہے کہ RSS سے وابستہ تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل طلبہ آج عدلیہ، پولیس، انٹیلی جنس ایجنسیوں، بیوروکریسی، اور تعلیمی اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ یوں یہ ادارے ملک کے فکری و انتظامی ڈھانچے میں اپنی سوچ کے حامل افراد کو داخل کر کے ایک مضبوط اثر پیدا کر چکے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مسلم تعلیمی ادارے اب تک ایک واضح منصوبہ بندی اور طویل المیعاد ویژن کے بغیر کام کر رہے ہیں۔ وسائل کی کمی، جدید نصاب سے دوری، اور تنظیمی بکھراؤ نے انہیں کمزور کر دیا ہے۔

جہاں RSS کی اسکیم دہائیوں پر محیط ہے، وہاں مسلم برادری کی تعلیمی کاوشیں زیادہ تر وقتی یا انفرادی نوعیت کی ہیں۔ یہ تفاوت صرف اعداد و شمار کا نہیں بلکہ سماجی حقیقت کا ہے۔ تعلیم کے میدان میں پسماندگی نے مسلمانوں کو سرکاری اداروں اور فیصلہ ساز سطحوں سے دور کر دیا ہے، جب کہ RSS اور اس کے تربیت یافتہ لوگ اعلیٰ مناصب تک پہنچ چکے ہیں۔

لہٰذا مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ تعلیم کو اپنی بقا، عزت، اور ترقی کا اوّلین ذریعہ سمجھیں۔ کیونکہ جو قوم تعلیم پر قابض ہے، دراصل مستقبل پر قابض ہے۔

آر ایس ایس اسکولوں کا نظام اور مسلم طلبہ پر اثرات

آر ایس ایس کے اسکول بظاہر ریاستی یا مرکزی حکومت کے منظور شدہ نصاب پر عمل کرتے ہیں، مگر اُن میں اضافی نظریاتی مواد شامل کیا جاتا

ہے جو طلبہ کے ذہنوں میں مخصوص فکری زاویہ پیدا کرتا ہے۔

نصابِ تاریخ میں مسلم حکمرانوں یا اسلامی تہذیب کا ذکر منفی انداز میں کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو حملہ آور، جابر یا بیرونی طاقت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ قومی شناخت کو ''ہندو راشٹر'' (Hindu Rashtra) کے نظریے سے جوڑ کر سمجھایا جاتا ہے، گویا بھارت صرف ہندوؤں کا ملک ہے۔ روزانہ کی اسمبلیوں میں ہندو مذہبی نغمے، سنسکرت شلوک (Slokas) اور پوجا کے منتر پڑھے جاتے ہیں، جن میں تمام طلبہ کی شرکت لازمی سمجھی جاتی ہے۔ دیوالی، ہولی، درگا پوجا جیسے تہوار بڑے جوش وخروش سے منائے جاتے ہیں، جبکہ عید اور بقرعید، جیسے اسلامی تہوار مکمل طور پر نظر انداز کیے جاتے ہیں۔

جب کسی مسلمان بچے کو ایسے تعلیمی ماحول میں رکھا جاتا ہے، تو وہ شناختی کشمکش کا شکار ہوجاتا ہے۔ گھر میں اسے ایمان، توحید، اور اسلامی آداب سکھائے جاتے ہیں، مگر اسکول میں اُسے ایسی اقدار اور روایات سکھائی جاتی ہیں جو اُس کے عقیدے سے میل نہیں کھاتیں، صبح کی اسمبلی میں ہندو ترانوں کا گایا جانا، پوجا کی رسومات، یا تاریخی ابواب میں ہندو قوم پرستی کی مرکزی حیثیت۔ نتیجتاً بچہ نہ پوری طرح اپنے مذہبی ماحول میں مطمئن رہ پاتا ہے، نہ ہی اسکولی ماحول میں خود کو قبول شدہ محسوس کرتا ہے۔ یہ کشمکش رفتہ رفتہ اس کے اندر احساسِ تنہائی اور غیر وابستگی پیدا کر دیتی ہے۔

جب عبادت، روزہ یا عید جیسے مذہبی مظاہر کو اسکول میں جگہ نہیں دی جاتی، تو بچہ خود کو اجنبی سمجھنے لگتا ہے۔ یہ احساس اس کے سماجی اعتماد کو کم کرتا ہے اور وہ اپنے ہم جماعتوں سے الگ تھلگ ہونے لگتا ہے۔ وقت کے ساتھ یہ رویہ نفسیاتی دباؤ میں بدل جاتا ہے۔

جب درسی کتابوں میں مسلمانوں کو محض حملہ آور یا بیرونی طاقت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، اور اُن کی علمی، تہذیبی یا انسانی خدمات کو نظر انداز کیا جاتا ہے، تو بچہ غیر شعوری طور پر اپنی تاریخ اور اپنی شناخت سے شرمندگی محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ اثرات سماج کی ہم آہنگی پر بھی ضرب لگاتے ہیں۔ ایسے بچے جب بڑے ہو کر عملی زندگی میں داخل ہوتے ہیں، تو وہ عدلیہ، پولیس، میڈیا یا سرکاری محکموں میں بھی اسی ذہنیت کے ساتھ کردار ادا کرتے ہیں۔ اس سے بین المذاہب اعتماد اور سماجی ہم آہنگی کمزور ہوتی ہے، اور معاشرہ تقسیم در تقسیم کا شکار ہوجاتا ہے۔

نتیجہ اور تجویز

بلاشبہ تعلیم قوتِ تبدیلی ہے۔ اگر ہندوستانی مسلم برادری اپنا مستقبل محفوظ اور باعزّت بنانا چاہتی ہے تو تعلیم کو محض اختیارِ فردی نہیں بلکہ قومی حکمتِ عملی کی صورت میں اپنانا ہوگا۔ RSS جیسی منظم تنظیمی قوتوں نے طویل منصوبہ بندی کے ذریعے تعلیمی میدان میں اپنا اثر بڑھایا ہے؛ اسی طرح مسلمان بھی منظم اور قابلِ عمل پالیسیوں کے ذریعے اپنی کمیونٹی کو تعلیم کے ذریعہ مضبوط کر سکتے ہیں۔

تعلیمی خود کفالت، معیاری نصاب، اساتذہ کی تربیت، اور سیاسی وسماجی نمائندگی۔ یہ سب مل کر وہ بنیادیں ہیں جو آنے والی نسلوں کو تحفظ، وقار اور مواقع فراہم کریں گی۔

اب عمل کا وقت ہے

گفتار کے بجائے کام، منصوبہ بندی کے ساتھ وسائل، اور مسلسل نگرانی کے ساتھ نتائج۔ اگر مسلمانوں نے یہ راستہ اختیار کیا تو وہ نہ صرف اپنے حقوق بحال کریں گے بلکہ ہندوستانی قومیت کے متنوع نصاب میں مضبوط اور متحرک شراکت دار بن کر ابھریں گے، ان شاء اللہ۔

☆☆☆

بقیہ: مبلغ افسر کی داستان---

آج ان کی زندگی کا خاتمہ بھی تعجب خیز تھا، جمعہ کی نماز باجماعت ادا کی اور سنت ونفل ادا کرنے لگے، نفل کے بعد بیٹھ کر اٹھنے میں کچھ کمزوری محسوس ہوئی، نمازیوں کی مدد سے کھڑے ہوگئے اور آہستہ آہستہ قیام گاہ پر آگئے، اہلیہ سے کہا کہ کھانا لگاؤ اور خود برابر پڑے پلنگ پر دراز ہو گئے، دسترخوان لگ گیا اور آواز دی گئی کہ کھانے کے لیے آیئے، برابر آواز دینے پر بھی جب کوئی جواب نہیں ملا تو قریب میں آ کر پکارا، پھر بھی کوئی جنبش نہیں ہوئی، صاحبزادہ ڈاکٹر تھے، انہوں نے آ کر دیکھا اور رونے لگے کہ والد کی وفات ہوچکی ہے۔

شرعاً مردہ کو جلد سے جلد دفن کیا جانا چاہیے، اس لیے فوراً آخری عمل اور کفن وغیرہ کا انتظام ہوا اور موت کے چند گھنٹوں کے بعد ہی جنازہ قبرستان کے لیے روانہ ہوگیا، انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی، تبلیغی جماعت کے ارکان اور اعزاء واقارب کاندھا دیتے ہوئے جنازے کو قبرستان لے آئے اور اس طرح اس سبکدوش اعلیٰ افسر کی تدفین عمل میں آئی ہے۔

☆☆☆

آدابِ اختلاف

فقہی اختلاف اور سلف کا طریقۂ کار

ڈاکٹر سید عبدالرشید (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، عالیہ یونیورسٹی)

فقہی اختلاف مسلمانوں کے داخلی مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ ہے۔ فقہی اختلاف کی حیثیت اور حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ذہنی اور فکری انتشار کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، اور جب اس میں تعصب اور ہوائے نفس کو راستہ ملتا ہے تو امت کا جسم اندر ہی اندر کھوکھلا ہوتا جاتا ہے۔ فقہی اختلاف کے بارے میں قرآن مجید، سیرت رسول اور طریقہ سلف صالحین میں سے ہمیں جو رہنمائی ملتی ہے اس کو مدنظر رکھنے سے اس انتشار کو کم کرنے میں مدد ملتی ہے، فقہی اختلاف کی شرعی حیثیت بھی متعین ہوتی ہے، اور عام ذہن کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

فقہی مسائل میں اختلاف کی حیثیت

اختلاف کی دو قسمیں ہیں، پہلا اصولی اور دوسرا فروعی۔ اصولی اختلاف عقائد، ضروریات دین اور اصول شریعت میں پایا جانے والا اختلاف ہے، یہ اختلاف مذموم ہے۔ اصول دین میں اختلاف کی وجہ سے کفر واسلام کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ فروعی اختلاف، فرعی اور ذیلی مسائل میں پایا جاتا ہے، یہ اختلاف مذموم اور ممنوع نہیں ہے۔

فقہی مسائل کا اختلاف اسی دوسری قبیل سے ہے، اس کو فروعی اختلاف کے نام سے جانا جاتا ہے، یہ کفر واسلام اور حق و باطل کا اختلاف نہیں ہے، کیوں کہ یہ اختلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں صحابہ کرامؓ کے درمیان بھی پایا جاتا تھا، اس کی مشہور مثال وہ حدیث ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اپنے گھروں سے فورا نکلنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: "لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظة" (ہر شخص عصر کی نماز بنو قریظہ کے محلہ میں پہنچ کر ہی ادا کرے)۔ (بخاری: ۹۴۶)

صحابہ کرام کی ایک جماعت راستہ ہی میں تھی کہ عصر کا وقت ختم ہونے لگا، چند افراد نے کہا کہ ہم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق منزل پر پہنچ کر ہی نماز پڑھیں گے، چاہے نماز قضا ہوجائے۔ جبکہ وقت کی کمی کو دیکھتے ہوئے دوسرے لوگوں نے یہ کہہ کر نماز پڑھ لی کہ حضور کے ارشاد کا مقصد جلدی پہنچنا تھا، اس لئے نماز عصر کو قضا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ واقعہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے دونوں میں سے کسی کو بھی غلط نہیں ٹھہرایا۔

اس واقعہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ میں کچھ لوگوں کا مزاج ظاہری الفاظ کی پابندی کا تھا، جب کہ دوسرے کچھ ایسے بھی تھے، جو مسئلہ کی روح اور مقصد پر نگاہ رکھتے تھے۔ اسی طرح کے دوسرے اسباب بھی تھے، جن کی وجہ سے صحابہ میں دوسرے کئی مسائل پر اختلاف ہوا ہے، مثلا حضرت ابن عمر کی رائے تھی کہ میت کو گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے (بخاری: ۱۲۸۶) جبکہ حضرت عائشہ کی رائے یہ تھی کہ گھر والوں کے رونے کی وجہ سے میت کو عذاب نہیں ہوتا ہے (بخاری: ۱۲۸۸)

یہاں حضرت ابن عمر الفاظ حدیث کے ظاہر کو دیکھتے تھے۔ جب کہ حضرت عائشہؓ اس کو کسی اور سبب پر محمول کرتی تھیں، اور استدلال کرتے ہوئے فرماتی تھیں کہ کسی شخص کو دوسرے کے کرنے کی سزا نہیں ملتی ہے۔

یہ اور اس قسم کے کئی مسائل تھے، جن میں صحابہ کے درمیان اختلاف ہوا، لیکن انہوں نے اس کی وجہ سے کسی کے کفر واسلام کا فیصلہ نہیں کیا۔ کیوں کہ یہ فروعی مسائل کا اختلاف تھا، اور فروعی مسائل میں اختلاف منع نہیں ہے، بلکہ یہ جائز اختلاف ہے، جو امت کے لئے آسانی اور رحمت پیدا کرتا ہے۔

عصر حاضر کے مشہور عالم اور محدث محمد عوامہ لکھتے ہیں کہ کہ فروعی مسائل میں اختلاف کے جائز ہونے کی دلیل یہ بھی ہے کہ صحابہ کرام نے ان مسائل میں اختلاف کیا ہے، اور اس قسم کے اختلاف کو غلط قرار نہیں دیا ہے
(ادب الاختلاف فی مسائل العلم والدین)

لہٰذا اس کی وجہ سے کسی اختلاف کرنے والے کو الزام دینا درست نہیں ہے۔

سلف کے نزدیک فقہی اختلاف

ایک عام ذہن یہ پایا جاتا ہے کہ فقہی اختلاف کو ختم کر کے امت کو ایک مسلک پر جمع کر دیا جائے۔ یہ بھی رائے دی جاتی ہے کہ یہ اختلاف نہ ہوتا یا ختم ہوجاتا تو امت کے حق میں بہتر ہوتا۔ یہ تصور دراصل عقلی اور نقلی دونوں اعتبار سے درست نہیں ہے۔

سلف صالحین نے فقہی اختلاف کو ایک نعمت اور رحمت کے طور پر دیکھا اور قبول کیا تھا، اور ایسے وقت میں جب کہ اس کو ختم کرنے کی کوشش کی جاسکتی تھی، ختم نہ ہونے دیا تھا۔ یہاں دو مثالیں ذکر کی جاتی ہیں، جن پر غور کرنے سے اس بات کو سمجھنے میں مدد ملے گی:

(الف) حضرت عمر بن عبد العزیزؒ (مدت خلافت: ۹۹ ھ تا ۱۰۱ ھ) خلیفہ ہونے کے ساتھ

ساتھ ایک جلیل القدر عالم بھی تھے، فقہی اختلاف کا آغاز آپ کی خلافت سے بہت پہلے ہو چکا تھا، خلیفہ بننے سے پہلے مختلف مقامات پر تقرری کی وجہ سے لوگوں کے حالات سے بھی باخبر تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ اگر صحابہ میں اختلاف نہ ہوتا تو یہ کوئی پسندیدہ بات نہ ہوتی، کیوں کہ سب ایک ہی طریقہ پر ہوتے تو امت تنگی میں پڑ جاتی۔ ایک سے زائد آراء ہونے کی وجہ سے کسی کے بھی طریقہ کو اختیار کرنے کی گنجائش باقی ہے۔

(ابو عمر ابن عبد البر، جامع بیان العلم وفضلہ)

ایک مرتبہ حمید الطویل نامی ایک عالم نے ان سے عرض کیا کہ اگر آپ (فقہی اختلاف کو ختم کر کے) تمام امت کو ایک ہی طریقہ پر عمل کرنے والا بنا دیں تو بہتر ہوگا۔ لیکن حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اس کو منظور نہیں کیا، بلکہ سرکاری فرمان جاری کیا کہ ہر علاقے میں وہاں کے فقہاء کی تحقیق کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ (سنن دارمی: ۶۵۲)

دوسری مثال دوسری صدی کے درمیان کی ہے، ابو جعفر منصور (مدت خلافت: ۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ) ایک صاحب علم خلیفہ گذرا ہے، اس نے اپنے دور کے بڑے امام اور محدث امام مالکؒ (وفات: ۱۷۹ھ) سے خواہش کی کہ حدیث اور فقہ میں وہ جو کتاب تحریر کر رہے ہیں، اجازت دیں تو اس کے نسخے تیار کروا کر تمام عالم اسلام میں بھجوا دئے جائیں، تاکہ سب لوگ اسی کے مطابق عمل کریں، اور جو مخالفت کرے، اس کو سزا دی جائے۔ یہ سن کر امام مالک نے جواب دیا: ''امیر المومنین! حضرت عمر کے دور میں جب مختلف علاقوں میں دین پھیلا تو انہوں نے صحابہ کرام کو معلم بنا کر روانہ کیا تھا۔ اب وہاں کئی نسلوں سے صحابہ کا بتایا ہوا طریقہ رائج ہے، آپ اگر اس کو تبدیل کرنا چاہیں گے، تو لوگ (ناواقفیت سے) اس کو کفر کے برابر سمجھ لیں گے۔ لہٰذا سب کو اپنے اپنے طریقہ سے عمل کرنے دیجئے''۔

(عبد الرحمن بن ابی حاتم، الجرح والتعدیل)

ان دونوں واقعات پر غور کیجئے، آپ کو نظر آئے گا کہ ظاہری طور پر اختلاف ختم کرنے کے اسباب مہیا تھے، کیونکہ عہد رسالت کو زیادہ زمانہ نہیں گذرا تھا، اختلافات نے مسلکی شکل اختیار نہیں کی تھی، خلیفہ کو اس مسئلہ میں ذاتی دلچسپی تھی، کسی مسلک کے بانی کے لئے یہ بہترین موقع تھا کہ صرف اپنے طریقہ کو فروغ دینے کے لئے اس سے فائدہ اٹھا سکے، لیکن دونوں بزرگان سلف عمر بن عبد العزیزؒ اور امام مالکؒ نے ایک مخلص عالم ہونے کے ناطے نیز شریعت کا مزاج شناس ہونے کی وجہ سے اختلاف کو ختم کرنے سے گریز کیا، کیوں کہ وہ اختلاف کو شریعت کی خصوصیت سمجھتے تھے۔ اور اس وسعت اور سہولت کو کھونا نہیں چاہتے تھے، جو امت کو مختلف آرا کی وجہ سے حاصل تھی۔

اختلاف نہیں سہولت

یہی وہ نکتہ تھا، جو صحابہ کرام، تابعین، اور بعد کے مخلص علما کے پیش نظر تھا، وہ اختلاف کو ایک مشکل کے بجائے ضرورت اور سہولت کے طور پر دیکھتے تھے۔ طلحہ بن مصرفؒ ایک تابعی ہیں، جب ان کے پاس فقہی اختلاف کا ذکر ہوتا تو کہتے: اس کو اختلاف مت کہو، بلکہ وسعت اور گنجائش کا نام دو۔

(ابونعیم اصبہانی، حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء)

اختلاف کو باقی رکھنا منشائے خداوندی

یہ وسعت اور گنجائش جس کو اختلاف کا نام دیا گیا ہے، شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ ہے، اس سے شریعت کے مقصد کی تکمیل ہوتی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث سے اس پر روشنی پڑتی ہے، ان کے ایک شاگرد عبد اللہ بن قیسؒ نے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ وتر کی نماز کب ادا کرتے تھے، ابتدائی رات میں، یا اخیر رات میں؟ انہوں نے جواب دیا: دونوں طریقے اختیار کرتے تھے، کبھی شروع رات میں پڑھ لیتے، اور کبھی اخیر میں ادا کرتے۔ یہ سن کر عبد اللہ بن قیس نے کہا: اللہ کا شکر ہے کہ مسئلہ میں وسعت ہے۔ پھر پوچھا: نفل نماز میں حضور ﷺ آہستہ قرأت کرتے تھے، یا بلند آواز سے؟ انہوں نے جواب دیا: دونوں طرح سے پڑھتے تھے، کبھی زور سے کبھی آہستہ۔ یہ سن کر عبد اللہ نے دوبارہ کہا: اللہ کا شکر ہے کہ دین میں وسعت ہے۔ پھر پوچھا: رات میں ضرورت پڑنے پر غسل کر کے سوتے تھے، یا صبح اٹھ کر غسل کرتے تھے؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا: دونوں طرح سے کرتے تھے، کبھی غسل کر کے آرام فرماتے، اور کبھی صرف وضو کر کے سو جاتے تھے۔ یہ سن کر انہوں نے کہا: اللہ کا شکر ہے کہ مسئلہ میں وسعت ہے (مسلم ۳۰۷)

یہ حدیث ہمیں بتارہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی مسئلہ میں ایک سے زائد طریقوں کا ثبوت سہولت کے لئے تھا نہ کہ انتشار کے لئے۔ ایک سے زائد طریقوں کی مشروعیت اتفاقی نہیں، بلکہ قصداً باقی رکھی گئی ہے۔

اس مسئلہ پر عقلی اعتبار سے غور کیجئے، اختلاف کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ شریعت کے نصوص میں بہت سی عبارتوں کے اندر ایک سے زائد معنیٰ کی گنجائش ہے، اگر شریعت میں اختلاف کو ختم کرنا مقصود ہوتا تو ایسے الفاظ ہی استعمال نہ کیے جاتے، جن سے ایک سے زائد معنیٰ کی گنجائش پیدا ہوتی۔

(باقی صفحہ ۲۲/پر)

محاسن اسلام

مصلحت پسندی اور اسلام

طلحہ نعمت ندوی (پٹنہ)

انسان مصلحت پسند ہے، بلکہ مصلحت پسندی اس کی فطرت میں شامل ہے، چنانچہ وہ اس کے مطابق اپنے کاموں میں تبدیلی لاتا ہے اور اس طرح دوسروں کے ساتھ زندہ رہنے کا حق حاصل کرتا ہے۔

دوسری طرف اللہ تعالی کے مطالبات ہیں جو انسانوں کی مصلحت سے کبھی کبھی ٹکراتے ہیں اور مصلحت کبھی کبھی ان سے دستبردار ہونے کا مطالبہ کرتی ہے۔تقریباً ہر قوم میں مذہب کا تصور یا اپنے کچھ نہ کچھ نظریات موجود ہیں جس سے اس کا قومی اور ملی وجود قائم ہے، اگر وہ ختم ہوجائیں تو اس کی شناخت مٹ جائے۔

ایسی صورت میں جب کسی دوسری قوم کا دباؤ پڑتا ہے اور وہ کمزور ہو کر اس کا مقابلہ نہیں کر پاتی تو اس کے پاس دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں، یا وہ غالب قوم کا مطالبہ قبول کرلے، اپنے تشخص سے دستبردار ہوجائے اور اس طرح اپنا ملی وجود کھو بیٹھے یا اس کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوجائے اور اپنے قومی شناخت کے خاتمہ کو اپنے وجود کا خاتمہ تصور کرتے ہوئے خود کو اس کے لیے قربان کردے۔ایک تیسری صورت بھی بعض حالات میں ممکن ہوتی ہے کہ حالات کے مطابق جہاں تک ممکن ہو ان کے رنگ میں خود کو ڈھالنے کی کوشش کرے اور وقت ملنے پر پھر اپنے قدیم راستہ پر واپس آجائے۔

دنیا کی تاریخ اگر اٹھا کر دیکھی جائے تو تقریباً ان تمام قومی تحریکات اور فکری اداروں نے ایسا ہی کیا ہے جن کا وجود باقی ہے اور ان کی کوئی قومی جماعتی شناخت ہے۔ان کے افراد ذاتی طور پر بھی ایسا ہی کرتے ہیں اور وقت پڑنے پر ان کی قومی ولی قیادت بھی یہی فیصلہ کرتی ہے۔

یہودیت جس طرح آج برسر اقتدار ہے وہ کسی سے مخفی نہیں لیکن ہزاروں سال کی مظلومیت کی طویل تاریخ میں انھوں نے اپنا وجود کس طرح بچا کر رکھا، کیا وہ اسی شناخت کے ساتھ ہمیشہ رہے یا دور مظلومیت میں اپنے بہت سے شعائر اور مذہبی فرائض کو ترک کیا جس سے ان کا وجود بچ سکا۔

ہندوستان میں ہندوؤں کی تاریخ پر غور کیا جائے کہ مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دور میں وہ کس طرح یہاں رہے تو معلوم ہوگا کہ ان کو اپنے بہت سے مسائل میں سمجھوتہ کرنا پڑا، اور آج انہیں جن ظواہر پر اصرار ہے نصف صدی قبل تک ان کے یہاں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی، اگر مسلمانوں کے دور اقتدار میں وہ ان چیزوں پر اصرار کرتے تو اپنا وجود کھو دیتے، اور یہی حال آج بھی ان کا مسلم ممالک میں ہے، کہ وہاں انھیں ان مظاہر پر اصرار نہیں ہے، اس طرح ایک ہی قوم دو جگہوں پر دو الگ الگ تصورات سے وابستہ ہے کیوں کہ وہاں اس کا وجود وبقا اسی پر موقوف ہے، اس لیے ایسا کرنا کوئی معیوب نہیں ہے جیسا کہ مسلم وغیر مسلم دانشوروں کی بڑی تعداد کا کہنا ہے کہ اسلام اپنی طاقت کے دور میں وہ نہیں معلوم ہوتا جو اپنی کمزوری کے دور میں نظر آتا ہے، دوسری طرف ان بہت سے حرفیت پسند علماء کے لیے بھی اس میں سبق ہے جو کسی بھی حال میں فقہی جزئیات سے ذرہ برابر ہٹنا گوارا نہیں کرتے اور مسلمانوں کی شہادت اور جان کی قربانی کو ان ظواہر پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم کسی طرح اپنے ان مذہبی اصولوں سے دستبردار نہیں ہوسکتے جن کو چھوڑ دینا ہمارے لیے دینی و ملی خودکشی کے مرادف ہے، لیکن بہت سے ظواہر بھی ایسے ہیں جن پر اصرار کہیں کہیں ہمارے ملی وجود کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔

ہماری تاریخ میں اس کی دسیوں مثالیں موجود ہیں کہ انسانی اور مسلم جانوں کے تحفظ کی خاطر مصلحت کو مقدم رکھا گیا اور ایسی چیزوں کی اجازت دے دی گئی جو کلی طور پر تو نہیں لیکن جزوی طور پر اسلام کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھیں۔

میدان جنگ سے فرار پر اسلامی تعلیمات میں سخت وعید آئی ہے، لیکن حضرت خالدؓ بن الولید غزوہ موتہ میں مسلمانوں کی بقیہ فوج کو بچا کر لے آنے میں کامیاب ہوگئے تو اس پر دربار نبوت سے ان کی تحسین کی گئی جب کہ مسلمان سخت ناراض تھے، حالاں کہ ان کے لیے لڑ کر شہید ہوجانے کا اچھا موقع تھا۔

اسی طرح حضرت حذافہ سہمی نے ایک رومی ظالم بادشاہ کی پیشانی کو بوسہ دے کر چالیس مسلمانوں کی جان بچالی تو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے واپسی پر نہ صرف ان کی تحسین فرمائی بلکہ خود ان کی پیشانی کو بوسہ دیا۔جب کہ وہ اسلام کا عہد زریں اور دور عروج تھا، اور چالیس مسلمانوں کی شہادت سے کوئی بڑا فرق نہیں ہوتا، نیز یہ بھی ممکن تھا کہ سیدنا عمر اس کے مقابلہ میں ایک لشکر روانہ فرما کر اس کی سرزنش فرماتے، لیکن چالیس مسلمانوں کی قدر ان کی نگاہ میں کس قدر تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگانا مشکل نہیں۔

یقیناً شہادت مطلوب ہے لیکن اپنا ملی وجود باقی رکھنا اور دنیا میں توحید کا پیغام عام کرنا بھی اور شرک سے دنیا کو پاک کرنا بھی بعثت انبیاء کا اساسی مقصد ہے، اور تخلیق انسانی سے اللہ تعالی کا

مقصود بھی یہی ہے، اگر جزئی مسائل ومباحث پر اصرار کے مقابلہ میں شہادت کو ترجیح دی جائے تو یہ مقصود الٰہی پورا نہیں ہوسکتا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کہاں اور کن حالات میں اس طرح کے اقدام کو قبول کر سکتے، اور اسلام کی وہ کون سی اساسات ہیں جن سے ہم بطور مصلحت، مجبوری میں دستبردار ہو سکتے ہیں۔

یہ فیصلہ مختلف حالات میں اجتماعی غور وفکر کا متقاضی ہے۔ ورنہ عام حالات میں سپر اندازی قومی تحریک کے لیے سخت نقصان دہ اور بزدلی کا پیش خیمہ بلکہ قومی روح کے لیے پیام موت ثابت ہوتی ہے۔

جہاں حالات کے تقاضے ہیں وہاں یہ بھی اپنی جگہ قرآنی حقیقت ہے کہ دیگر مذاہب بالخصوص یہود ونصاریٰ ہم سے اس وقت تک مطمئن نہیں ہوسکتے جب تک کہ ہم ان کی ہر رائے نہ قبول کرلیں بلکہ بصورت دیگر اپنے مذہبی اصولوں سے ہی دستبردار نہ ہوجائیں، قرآن پاک نے ایسے یقینی لب ولہجہ میں یہ بات کہی ہے کہ شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی اور اسلام کی پوری تاریخ اس کی گواہ ہے، یہی حال دیگر مذاہب کا بھی ہے۔

اس لیے اجتماعی غور وفکر، ترجیحات کے تعین اور اپنے ملی تشخص اور اپنے دین پر پورے اعتماد کے ساتھ اور سامنے والے کے مزاج کو پیش نظر رکھتے ہوئے بہت سے مسائل میں سمجھوتہ کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر ایسے حالات پیش آجائیں جہاں اپنا ملی تشخص اور قومی وجود خطرہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو یا ہمارے اصول دین میں اس کی گنجائش بالکل نہ ہو تو ایسی صورت میں قربانی دینے کے لیے تیار رہنا ہی بہتر ہے، اور اسی میں اس دین کی بقا کی ضمانت ہے اور تاریخ سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔

اگر کہیں ایسے حالات ہوں کہ اجتماعی طور پر اپنے دین وایمان کی حفاظت ظاہری طور پر تو نہیں البتہ خفیہ طور پر ممکن ہو تو پھر ایسا ہی کرنا اور اس دوران خاموشی سے اس صورت حال کے ازالہ کی جدوجہد میں مشغول رہنا بہتر معلوم ہوتا ہے اور بہت سی قوموں نے اپنا وجود اسی طرح باقی رکھا ہے۔

انفرادی طور پر تو جان بچانے کے لیے کلمہ کفر بھی زبان سے ادا کیا جاسکتا ہے جب کہ دل مطمئن ہو اور کوئی مستقل پابندی نہ ہو لیکن اجتماعی طور پر ایسا کرنا بہ ظاہر ملی وقومی وجود کو سخت نقصان پہنچا سکتا ہے۔

بہت سے لوگوں کو اپنی تہذیب پر بھی اصرار رہتا ہے، حالاں کہ سچ یہ ہے کہ ضرورت کے وقت تہذیب کو مذہب پر قربان کردینے میں کوئی حرج نہیں، تہذیب کو بچانے کے لیے مذہب کا سودا نہیں کیا جاسکتا خاص طور پر اصول مذہب میں کسی طرح کا سمجھوتہ ممکن نہیں۔ ایسی صورت میں ترجیحات کا تعین زمان ومکان کے اعتبار سے مختلف ہوسکتا ہے جو دانشوران قوم کی غور وفکر کا متقاضی ہوتا ہے۔

☆☆☆

بقیہ: فقہی اختلاف-----

بلکہ اختلافی مسائل کے بارے میں قرآن یا حدیث میں اس قدر وضاحت کردی جاتی کہ اختلاف جڑ سے ختم ہوجاتا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا، اور اختلاف کے راستے کھلے رکھے گئے تاکہ امت کے لئے سہولت اور وسعت باقی رہے۔

اختلاف زندگی کی حقیقتوں میں سے ایک بنیادی حقیقت ہے، جس کو ختم کرنے کے بجائے برداشت کرنے عادت ڈالنی چاہئے، اور مختلف فقہی مسالک کو انتشار کے بجائے تنوع کا ذریعہ بنانا چاہئے، ایسا تنوع جو باہم مل کر اتحاد کو تقویت دیتا ہو، نہ کہ نقصان پہنچاتا ہو۔

☆☆

بقیہ: تعارف وتبصرہ

ان امور کی شرعی حیثیت کیا ہے، اور ناجائز اور حرام امور میں بچاؤ کی کیا کیا شکلیں ہوسکتی ہیں۔

۱۷۴ر صفحات کی یہ کتاب بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اپنے موضوع کا احاطہ کیے ہوئے ہے، عصرِ حاضر کے تعلیمی مسائل پر صاحبِ کتاب کی دقیق النظری کا ثبوت ہے، اور جو مسلم بچے بچیاں عصری اداروں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں' ان کے والدین کے لیے ایک تحفہ ہے۔

۵- آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم:

مولانا جلیلی کی ان قلمی خدمات کے تعارف کے سلسلہ کا اختتام ہم مسک الختام کے طور پر ان کے رسالہ "آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم" پر کریں گے۔ یہ دراصل ربیع الاول کی مناسبت سے سوشل میڈیا پر پیش کردہ ان کا ایک سلسلہ تھا، جس کو ان کے برادر جناب شکیل اختر جلیلی ندوی صاحب نے ترتیب دے کر قابلِ اشاعت بنادیا ہے۔ یہ رسالہ آنحضور علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر وفات اور جانشینی تک کے مراحل کو آسان اور مختصر انداز میں بیان کرتا ہے، جس سے حیاتِ نبوی کا ایک پُرنور خاکہ قاری کی نگاہوں میں گھوم جاتا ہے، اور سیرتِ پاک کی وہ معلومات جو ہر خاص وعام کو ازبر ہونی چاہییں' محض ستر بہتر صفحات میں حاصل ہوجاتی ہیں۔

یہ تمام کتابیں 'فاران ایجوکیشنل اینڈ چیری ٹیبل ٹرسٹ، جھارکھنڈ' کے اہتمام سے شائع ہوئی ہیں۔ لکھنؤ میں مکتبہ احسان، شباب مارکٹ، کرناٹک میں جامعہ ضیاء العلوم، کنڈلور اور جھارکھنڈ میں دارالعلم دھنباد سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

رابطہ کے لیے: ۸۲۹۲۰۱۷۸۸۸

☆☆☆

اصلاح معاشرہ

معاشرتی اجتماعیت کا فقدان

محمد اسعد ندوی (آرگنائزر تفہیم شریعت کمیٹی، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

انسان فطری طور پر ایک سماجی مخلوق ہے۔ وہ تنہا زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی ضروریات دوسروں کے تعاون سے پوری ہوتی ہیں، لہٰذا اجتماعیت اس کی ایک فطری ضرورت ہے، معاشرتی اجتماعیت سے مراد یہ ہے کہ افراد مل جل کر باہمی تعلقات اور تعاون کے ساتھ ایک معاشرہ تشکیل دیں اور اجتماعی بھلائی کے لیے اکٹھے رہیں۔ اسلام معاشرتی نظم و ضبط، سماجی تنظیم اور اتحاد کا داعی ہے۔ اجتماعیت اور حسنِ معاشرت انسان کی فطرت کا حصہ ہیں اور انسان سماج کے بغیر رہنا پسند نہیں کرتا، اسی لیے اسلامی تعلیمات میں شروع سے ہی انسانی وحدت، بھائی چارے اور باہمی اتفاق پر زور دیا گیا ہے تاکہ ایک مضبوط اور مہذب معاشرہ وجود میں آئے۔

قرآن و حدیث میں جگہ جگہ مسلمانوں کو اجتماعیت سے جڑے رہنے اور اتحاد قائم رکھنے کی تلقین ملتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ’’اور سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور تفرقہ میں نہ پڑ‘‘ (آل عمران: ۱۰۳)

سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا: ’’مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ‘‘ (الحجرات: ۱۰)۔

یہاں تک کہ نماز جیسی عبادت میں بھی جماعت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ’’رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو‘‘۔ (البقرہ: ۴۳)

یعنی تنہا نہیں بلکہ مل کر نماز ادا کرو۔

احادیث نبویہ میں بھی اجتماعیت کی اہمیت کھول کر بیان ہوئی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ’’تم پر جماعت کو لازم پکڑے رہنا واجب ہے اور تفرقہ بازی سے بچو کیونکہ شیطان ایک (تنہا آدمی) کے ساتھ ہوتا ہے اور دو آدمیوں سے دور رہتا ہے۔‘‘ ایک اور مشہور حدیث میں اہلِ ایمان کی باہمی محبت، رحم دلی اور ہمدردی کو ایک جسم سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ: ’’مومن آپس میں محبت اور شفقت میں ایک جسم کی مانند ہیں، کہ اگر جسم کے ایک حصے کو تکلیف ہو تو سارا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے‘‘۔

ان قرآنی ہدایات اور نبوی ارشادات سے واضح ہے کہ اسلام میں اجتماعیت محض پسندیدہ نہیں بلکہ ایک لازمی دینی تقاضا ہے۔

اجتماعیت کے زوال کے اسباب

فرقہ واریت اور مسلکی تقسیم

ملت کے اندرونی فرقہ وارانہ اور مسلکی اختلافات نے مسلمانوں کی اجتماعیت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ افسوس کہ آج امت مسلمہ شدید انتشار کا شکار ہے؛ بہت سے افراد اجتماعیت کا دامن چھوڑ کر اپنے اپنے مفادات اور مخصوص مسلکی گروہوں کی حمایت میں بٹ گئے ہیں جس کے نتیجے میں اتحاد و یگانگت کی صورت انتہائی کمزور پڑ چکی ہے۔

معاشی و تعلیمی پسماندگی

مسلمانانِ برصغیر عمومی طور پر تعلیمی اور معاشی میدان میں پسماندگی کا شکار رہے ہیں۔ ہندوستان میں آزادی کے بعد بھی مسلمانوں کی خواندگی کی شرح قومی اوسط سے کم رہی ہے (مثلاً 2001ء میں مسلمانوں کی شرح خواندگی صرف 1.59 تھی جبکہ ملکی اوسط 8.64 تھی)۔ معاشی بدحالی اور جدید تعلیم میں پیچھے رہ جانے کے باعث مسلمان سماجی ترقی کی دوڑ میں دوسرے طبقات سے پیچھے رہ گئے۔ غربت اور تعلیم کی کمی نے نہ صرف معاشی ضعف پیدا کیا بلکہ قومی دھارے سے کٹ جانے کے احساس نے بھی اجتماعیت کے جذبے کو کمزور کیا۔

سیاسی نمائندگی کی کمی

ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے سیاسی حقوق کے لحاظ سے بھی کمزور نمائندگی کا مسئلہ درپیش رہا ہے۔ آبادی میں مسلمانوں کا حصہ اگرچہ تقریباً 14 فیصد ہے، لیکن پارلیمانی اور اسمبلی سطح پر ان کی نمائندگی ہمیشہ کم رہی ہے۔ مثال کے طور پر 2014ء میں لوک سبھا کے ایوان میں مسلمان اراکین کا تناسب محض 4 فیصد تھا، جو آبادی میں ان کے حصے سے بہت کم ہے۔ سیاست میں اس کم نمائندگی کے باعث مسلمانوں کے مسائل اور مطالبات مؤثر طریقے سے قومی ایجنڈے پر نہیں آ سکے، اور قیادت کے فقدان نے اجتماعی طور پر ملت کو کمزور اور منتشر رکھا ہوا ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات

فرقہ وارانہ فسادات اور باہمی عدم اعتماد: ملک میں وقفے وقفے سے پھوٹنے والے فرقہ وارانہ فسادات نے بھی مسلم اجتماعیت کے شیرازے کو شدید متاثر کیا ہے۔ ہندو مسلم فساد اور تشدد کے واقعات نے جہاں بڑے پیمانے پر جانی و مالی نقصان پہنچایا، وہیں مختلف فرقوں اور برادریوں کے مابین خوف اور عدم اعتماد کی فضا بھی قائم کر دی۔ حالیہ برسوں میں بھارت میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ہندو مسلم اتحاد کی صورتِ حال مزید ابتر

ہوئی ہے، جس کے نتیجے میں مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس بڑھا اور دوسرے طبقات سے سماجی فاصلہ بھی۔ جب معاشرے کے مختلف گروہوں کے درمیان بھروسہ مجروح ہو جائے تو باہمی میل جول اور تعاون بھی متاثر ہوتا ہے، اور یوں اجتماعیت کا ڈھانچہ کمزور پڑنے لگتا ہے۔

شیرازہ بندی کی عملی تجاویز

فرقہ وارانہ تعصبات کا خاتمہ

امت میں اتحاد کی بحالی کے لیے سب سے پہلے اندرونی مسلکی اور فرقہ وارانہ تعصّبات کا خاتمہ ضروری ہے۔ مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے لگانے یا نفرت پھیلانے کی روش ترک کرنا ہوگی۔ تمام مکاتبِ فکر کو وسعتِ قلبی کے ساتھ ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہوئے اخوتِ اسلامی کے تحت قریب آنا چاہیے۔ باہمی اختلافِ رائے کو تحمل سے برداشت کریں اور مشترکہ دشمنانِ اسلام کے مقابلے پر متحد ہوں۔ جب تک ہر مسلک اور فرقے کے لوگ خود کو پہلے مسلمان اور ایک امت کا حصہ نہیں سمجھیں گے، اس وقت تک اجتماعیت کی فضا بحال نہیں ہو سکتی۔

اسلامی اخلاق و تعلیم کا فروغ

مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے اور اسلامی اخلاقیات عام کرنے پر خصوصی توجہ دینی ہوگی۔ نئی نسل کو دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم میں بھی مہارت دلانا وقت کی اہم ضرورت ہے تا کہ وہ معاشی اور سماجی میدان میں پیچھے نہ رہیں۔ جہالت اور علمی پسماندگی اختلافات کو جنم دیتی ہے، جبکہ تعلیم شعور اور وسیع النظری کو فروغ دیتی ہے۔ ساتھ ہی اسلامی تعلیمات کے ذریعے نوجوانوں کے کردار و اخلاق کی تعمیر کی جائے تا کہ ان کے دل میں ایمان، تقویٰ، مساوات، اخوت اور ایثار جیسے اوصاف پیدا ہوں۔ جب مسلمانوں میں علم اور کردار ہوگا تو وہ متحد ہو کر اپنی قوم کی بھلائی کے لیے کام کریں گے اور اجتماعیت خود بخود مضبوط ہوتی جائے گی۔

خدمتِ خلق اور فلاحی منصوبے

مسلم معاشرے میں اتحاد پیدا کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ مشترکہ فلاحی اور رفاہی کام ہیں۔ خدمتِ خلق کی اسلامی تعلیم کے مطابق مسلمانوں کو چاہیے کہ ضرورت مندوں کی مدد اور بھلائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ غریبوں، یتیموں اور بے کسوں کی دستگیری کے لیے امدادی تنظیمیں اور ٹرسٹ قائم کیے جائیں، محلے کی سطح پر کمیٹیاں بنا کر ضرورت مند پڑوسیوں کا خیال رکھا جائے، اور صحت و تعلیم کے شعبوں میں خیراتی ادارے قائم کیے جائیں۔ جب مسلمان مل کر معاشرہ کی بھلائی کے لیے کام کریں گے تو اس سے نہ صرف ان کے درمیان بھائی چارہ بڑھے گا بلکہ دیگر برادریوں کا اعتماد بھی حاصل ہوگا۔ اجتماعی بھلائی کے یہ کام مختلف طبقوں کے درمیان فاصلے کم کرنے اور مشترکہ انسانیت کی بنیاد پر ایک مضبوط سماجی شیرازہ قائم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

ملّی و قومی ہم آہنگی

اجتماعیت کی بحالی کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان اپنے ملک کے دیگر مذہبی و سماجی گروہوں کے ساتھ بھی ہم آہنگی اور رواداری کا رویہ اختیار کریں۔ بھارت جیسے کثیر ثقافتی ملک میں ہندوؤں اور دیگر اقلیتوں کے ساتھ پرامن بقائے باہم اور خیر سگالی کے رشتے استوار کرنا ملی اتحاد کا حصہ ہونا چاہیے۔ مختلف مذاہب اور فرقوں کے درمیان مکالمہ، باہمی احترام اور انصاف کا رویہ اپنانے سے غلط فہمیاں دور ہوں گی اور قومی یکجہتی کو تقویت ملے گی۔ قرآن مجید نے "لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ" (تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین) کا اصول دے کر مذہبی آزادی اور بقائے باہم کی بنیاد فراہم کی ہے۔ اس قرآنی ہدایت کے تحت مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے عقائد کا احترام کریں اور ملکی آئین و قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے سب شہریوں کے ساتھ مل جل کر قومی ترقی میں حصہ لیں۔ اس طرزِ عمل سے بیرونی طور پر ایک پرامن معاشرہ تشکیل پائے گا اور اندرونی طور پر مسلمانوں کی بھی عزت و اعتماد میں اضافہ ہوگا۔

منظم سماجی و سیاسی کردار

مسلمانوں کو منتشر ہجوم کے بجائے ایک منظم قوت بننے کی ضرورت ہے۔ اجتماعیت کی بحالی کے لیے لازم ہے کہ ملی سطح پر مضبوط ادارے اور تنظیمیں قائم کی جائیں جو امت کی رہنمائی اور نمائندگی کا فریضہ انجام دیں۔ محلہ کمیٹیوں اور مقامی تنظیموں سے لے کر صوبائی اور آل انڈیا سطح تک ایسے پلیٹ فارم تشکیل دیے جائیں جہاں مسلمانوں کے تعلیمی، معاشی اور سماجی مسائل کا حل اجتماعی بصیرت سے تلاش کیا جائے۔ ملت کے باشعور افراد کو آگے بڑھ کر قیادت سنبھالنی ہوگی اور پوری قوم کو ایک مشترکہ ایجنڈے پر اکٹھا کرنا ہوگا۔ اسی طرح سیاسی میدان میں بھی حکمتِ عملی کے ساتھ منظم جدوجہد کی جائے۔ اپنے ووٹ کی قوت کو پہچانتے ہوئے مستحق اور اہل امیدواروں کو منتخب کیا جائے جو ایوانوں میں مسلمانوں کی مؤثر آواز بن سکیں۔ جب مسلمان سماجی اور سیاسی ہر دو میدانوں میں ایک منظم اور متحد قوم کے طور پر کردار ادا کریں گے تو نہ صرف ان کے حقوق کا تحفظ ممکن ہوگا بلکہ اجتماعیت کے ثمرات بھی بھرپور انداز میں حاصل ہوں گے۔

☆☆☆

ذرائع ابلاغ

فیک نیوز کا فتنہ

منور سلطان ندوی (رفیق مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء)

موجودہ دنیا جہاں ڈیجیٹل میڈیا کے بے شمار فوائد سے مستفید ہورہی ہے، وہیں اس کے نقصانات بھی کھل کر سامنے آنے لگے ہیں، ڈیجیٹل میڈیا کی وجہ سے جن چیلنجز کا سامنا ہے ان میں سب سے اہم اور نتیجہ کے لحاظ سے سب سے زیادہ موثر اور مہلک 'فیک نیوز' ہے۔

ڈیجیٹل میڈیا کے ہمہ گیر اثرات اور سکینڈوں میں ہر جگہ اس کی رسائی جہاں اس کا امتیاز ہے وہیں اس وسیلہ کو افواہ اور پروپیگڈہ کے لئے استعمال کیا جانا ایسی بدیہی حقیقت بن چکی ہے جس کو ہر باشعور انسان محسوس کرسکتا ہے۔

فیک نیوز کا سادہ مطلب ہے ایسی خبر جس کا وجود نہ ہو، یعنی جعلی اور من گڑھت خبر۔ خبر اور پروپیگنڈا دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے، تاریخ انسانی میں جب سے خبر کا وجود ملتا ہے اسی وقت سے پروپیگنڈا کا وجود مانا جاتا ہے، پریس کے دور سے قبل جہاں تعریف و توصیف میں قصائد لکھوانے کا ذکر ملتا ہے وہیں جھوٹے قصائد کا بھی ذکر ملتا ہے، پریس کے ایجاد کے نتیجہ میں جہاں علم کی شمع روشن ہوئی وہیں غلط معلومات کو بھی خوب پھلنے پھولنے کا موقع میسر آیا۔

جب صحافت کی شروعات ہوئی تو اس کی گود سے زرد صحافت کا وجود ہوا، ہٹلر کے وزیر اطلاعات جوزف گوئبلز کا یہ جملہ ضرب المثل بن گیا "اگر ایک جھوٹ کو بار بار اور پورے اعتماد سے بولا جائے تو لوگ اسے سچ سمجھنا شروع کردیں گے"۔ اسے نازی پروپیگنڈا سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

امریکہ اور سویت یونین کی جنگ میں اخبارات اور ریڈیو کے ذریعہ پروپیگنڈا کا خوب دور چلا اسے "سرد جنگ" کہا جاتا ہے۔

اکیسویں صدی میں انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کا وجود ہوا، اسی دور میں فیک نیوز کی اصطلاح عالمی سطح پر مشہور ہوئی، فیک نیوز سے دنیا پریشان ہے، ماہرین کی رائے ہے کہ نیوز کے مقابلہ میں فیک نیوز زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ گردش کرتی ہے، ایک مشہور قول کے مطابق: "سچ ابھی اپنے جوتے پہن رہا ہوتا ہے کہ جھوٹ آدھی دنیا کا چکر لگا چکا ہوتا ہے"۔

ایم آئی ٹی (MIT) یعنی میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کی ایک تحقیق کے مطابق، جھوٹی خبریں سچی خبروں کے مقابلے میں 6 گنا زیادہ تیزی سے پھیلتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جھوٹی خبروں میں "انوکھا پن" اور "جذباتی اشتعال" (غصہ یا خوف) زیادہ ہوتا ہے۔

سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل میڈیا کے غلط استعمال نے فیک نیوز سے جو تباہی مچا ہی اس کی رہی سہی کسر مصنوعی ذہانت (AI) کے ڈیپ فیک (DeepFake) ٹکنالوجی نے پوری کردی، اب صورت حال یہ ہے کہ فیک پر اوریجنل کا اور اوریجنل پر فیک کا گمان ہونے لگا ہے، ساکت تصویر اور متحرک تصویر جو کبھی واقعہ کی صداقت کی سب سے بڑی علامت شمار کی جاتی تھی اب کمال ہوشیاری سے ان دونوں میں ایسی تبدیلی کرنے کی صلاحیت وجود میں آگئی ہے کہ الامان والحفیظ!

فیک نیوز متعدد مقاصد کے لئے تیار کی جاتی ہیں، اور عام قارئین کی بے شعوری اور غفلت کی وجہ سے منٹوں میں وائرل ہوجاتی ہیں، میڈیا صارفین کی بے شعوری کی انتہاء تو یہ ہے کہ اکثر لوگ کسی پوسٹ کو غلط اور مشتبہ سمجھنے کے بعد بھی آگے فارورڈ کرنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس کرتے، نیم پر کریلا چڑھا یہ کہ بسا اوقات بعض تحریروں کے ساتھ یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ اس کو اتنی بار آگے شیئر کریں گے تو اتنا ثواب ملے گا، اور اس نوٹ کے ساتھ وہ تحریر گردش کرتی رہتی ہے۔

فیک نیوز بنانے والے اپنا مقصد حاصل کرنے میں اس لئے کامیاب ہوجاتے ہیں کہ عام صارفین فیک نیوز کے اثرات سے واقف نہیں ہیں، فیک نیوز کی وجہ سے مقتدر شخصیات سے اعتماد فوت ہوتا ہے، جب کسی شخص یا ادارہ کی طرف سے غلط خبریں نشر کی جاتی ہیں تو اس وجہ سے اس ادارہ یا شخص کی شبیہ متاثر ہوتی ہے، لوگ اس پر اعتماد کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ فیک نیوز سے امن وامان کا بھی خاص تعلق ہے، اکثر دیکھا گیا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کے پیچھے فیک نیوز ہوتی ہے، جھوٹی خبر جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے، اور صورت حال کچھ سے کچھ ہوجاتی ہے۔

فیک نیوز کے سیاسی اور معاشی نقصانات بھی بہت اہم ہیں، سیاست میں سارا کھیل ہی پروپیگنڈا کا ہوتا ہے، ووٹروں کے ذہنی رجحان کو بدلنے میں یہ آلہ سب سے موثر ثابت ہوتا ہے، اسی طرح بہت سی معاشی سرگرمیوں کی بنیاد ہی رائے عامہ پر ہوتی ہے، ایسی صورت میں فیک نیوز معاشرہ کو کہاں کہاں زخم لگاتا ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

فیک نیوز کی تباہی کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ مختلف صحافتی اداروں نے فیک نیوز کو چیک کرنے کے لئے فیکٹ چیک کے عنوان سے مستقل شعبے قائم کیے ہیں، بعض ادارے مستقل یہی کام کرتے ہیں کہ روزانہ کی بنیاد پر خبروں کی تصدیق کرتے ہیں اور تصدیق کی تفصیل بھی بیان کرتے ہیں، یہ طریقہ کارگر تو بہت ہے، مگر فیک نیوز آگ کی طرح پھیلتی اور سادہ ذہنوں کو مسموم کرتی ہوئی گزر جاتی ہے، اس کے چند گھنٹوں اور چند دنوں بعد اس خبر کے فیک ہونے کی خبر سامنے آتی ہے، اس وقت تک بہت کچھ ہو چکا ہوتا ہے۔

خبر کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر بہت ہی واضح ہے، سچ بولنا، سچ لکھنا اور زندگی کے ہر مرحلہ میں سچائی کے دامن کو تھامے رہنا اسلام کا بنیادی اصول ہے، قرآن اور احادیث میں صدق وامانت کی بہت زیادہ اہمیت بیان کی گئی ہے وہیں جھوٹ ،فریب، مکر کو بہت بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے۔

خبر کے حوالے سے قرآن کریم میں بہت بڑی بات کہی گئی ہے، اور افسوس کہ اکثر مسلمان اس قرآنی ہدایت سے غافل ہیں، سورہ حجرات میں کہا گیا کہ ہر خبر کی پہلے تصدیق کی جائے، اس کے بعد ہی اس کو ماننے یا رد کرنے کا فیصلہ کیا جائے:

یاایھا الذین آمنوا ان جاء کم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالة فتصبحوا علی مافعلتم نادمین۔ (حجرات: ٦)

اے مسلمانو! اگر تمہارے پاس کوئی غیر معتبر شخص کوئی خبر لائے تو اس کی خوب تحقیق کرلیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو ناواقفیت میں نقصان پہونچادو، پھر تم کو اپنی حرکت پر پچھتانا پڑے۔

اس آیت کریمہ میں خبر کی تحقیق کا باضابطہ حکم دیا گیا ہے، بغیر تحقیق کے اس کو قبول کرنے سے منع کیا گیا ہے، چہ جائیکہ اس کو آگے بڑھایا جائے، یا اس بنیاد پر کوئی رائے قائم کی جائے۔

دوسری بات یہ کہ خبر کی تحقیق نہ کرنے کا انجام واضح انداز میں بتادیا گیا، اس طرز عمل کو نہ اپنانے سے دوسروں کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے، ہر فیک نیوز کسی نہ کسی کے نقصان کا سبب ہوا کرتی ہے، اور یہ بات جگ ظاہر ہے۔

اس آیت میں اس جانب بھی حکیمانہ اشارہ موجود ہے کہ خبر کے بعد جذباتی ردعمل سے بچیں، کیونکہ اس طرز عمل کے بعد اکثر پچھتانے کی نوبت آتی ہے، اور نقصان پہنچ جانے کے بعد پشیمانی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

یہاں آیت کریمہ میں ''فاسق'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور فاسق کے معنی مجہول کے بھی ہیں، یعنی خبر کا ذریعہ ایسا ہے جو گم نام یا غیر معروف ہے یا ایسے شخص یا ادارہ کی طرف سے خبر آرہی ہے جو قابل اعتماد نہیں ہے، تب بھی طرز عمل یہی ہونا چاہئے کہ پہلے اس کی تصدیق کی جائے، اگر صحیح ہے تو قبول کیا جائے، ورنہ وہیں روک دیا جائے، اور ممکن حد تک اس کے تدارک کی کوشش کی جائے۔

رسول اللہ ﷺ کے فرمودات میں بھی جھوٹی خبر سے متعلق بہت سی اہم ہدایات موجود ہیں، یہ ہدایات تمام انسانیت کے لئے یکساں مفید ہیں، خاص طور پر مسلمان جو سب سے زیادہ فیک نیوز کے شکار ہیں، ان کو تو رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی باتوں کو حرز جان بنالینا چاہئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو نقل کردے:

کفی بالمرء کذباً أن یحدث بکل ماسمع۔ (صحیح مسلم)

احادیث میں زبان کی لغزشوں سے متعلق تفصیلات ہدایات موجود ہیں، موجودہ دور میں ان کا انطباق فیک نیوز پر جس طرح ہوتا ہے، اس کو سوچ کر ایک مسلمان کا ایمان تازہ ہوجاتا ہے کہ کس طرح رسول اللہ ﷺ نے تقریباً پندرہ سو سال قبل خبر اور جعلی خبر اور اس کے اثرات سے بچانے کے لئے امت کو اور امت کے واسطہ سے تمام انسانوں کو رہنما ہدایات دئے۔

متعدد اسلامی مفکرین اور مصلحین نے زبان کی آفت اور لغزش کی خطرات سے باخبر کیا ہے، امام غزالیؒ نے اپنی شاہکار تصنیف ''احیاء علوم الدین'' میں زبان کی آفتوں پر بہت تفصیلی اور نفسیاتی بحث کی ہے۔ فیک نیوز (جھوٹی خبروں اور افواہ سازی) کے حوالے سے ان کی تعلیمات آج کے دور میں حیرت انگیز طور پر فٹ بیٹھتی ہیں، امام غزالیؒ کے افکار کے مطابق جھوٹی خبر سے متعلق اہم نکات درج ذیل ہیں:

''جان لو کہ جھوٹ ایک عظیم گناہ ہے اور تمام عیوب کی جڑ ہے۔ جھوٹی خبر پھیلانا نہ صرف بولنے والے کے اخلاق کو تباہ کرتا ہے بلکہ سننے والے کے ذہن میں بھی فساد پیدا کرتا ہے۔''

(احیاء علوم الدین، کتاب: آفات اللسان)

''انسان کو تب تک خاموش رہنا چاہیے جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ جو وہ کہہ رہا ہے وہ سو فیصد سچ ہے اور اسے بیان کرنے میں کوئی فائدہ ہے''۔

''بہت سے لوگ اس لیے گناہ گار ہوتے ہیں کیونکہ وہ بغیر سوچے سمجھے دوسروں کی باتیں نقل کرتے ہیں، حالانکہ نقل کرنے والا بھی جھوٹ کے وبال میں برابر کا شریک ہوسکتا ہے اگر وہ

تحقیق نہ کرے۔“
”جب تمہیں کسی کے بارے میں کوئی بری یا جھوٹی خبر (چغلی/ افواہ) ملے، تو تم پر چھ باتیں واجب ہیں:
تصدیق نہ کرنا: اس خبر کو سچ نہ سمجھو، کیونکہ خبر لانے والا (اگر وہ چغل خور ہے) تو وہ ”فاسق“ ہے اور فاسق کی گواہی مردود ہے۔
منع کرنا: خبر لانے والے کو اس برائی سے روکو اور اسے نصیحت کرو۔
بغض نہ رکھنا: اس خبر کی بنیاد پر اس شخص کے بارے میں دل میں کینہ نہ پالو جس کے خلاف خبر دی گئی ہے۔
بدگمانی سے بچنا: جس شخص کے بارے میں خبر دی گئی ہے، اس کے بارے میں برا خیال نہ لاؤ۔
تجسس نہ کرنا: اس خبر کی کھوج میں نہ لگ جاؤ (یعنی مزید تحقیق کر کے تجسس میں نہ پڑو)۔
خود بھی آگے بیان نہ کرنا: جو بات تمہیں پہنچی ہے، اسے دوسروں کو بتا کر خود چغل خور یا جھوٹا نہ بنو۔
(احیاء العلوم کتاب: آفات اللسان، باب: النمیمہ)
ان کے علاوہ کردار کشی، بہتان، ظن، تجسس سے متعلق تفصیلی ہدایات موجود ہیں، ان سب کا تعلق فیک نیوز سے بہت گہرا ہے، بحیثیت مسلمان ان ہدایات پر عمل کریں تو فیک نیوز کا شکار ہونے سے بآسانی بچ سکتے ہیں۔
موجودہ وقت میں فیک نیوز کے فتنہ کا واحد حل یہی اسلامی تعلیمات ہیں، اسلامی تعلیمات ہر دور کے لئے ہیں، اور ہر دور میں اس کی معنویت کے نئے گوشے سامنے آتے رہیں گے، یہی اسلام کی حقانیت کی علامت ہے۔

☆☆☆

سیرت طیبہ کے سلسلۃ الذہب کا نیا شاہکار

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمۃ للعالمین

تالیف: حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مدظلہ العالی

عہد حاضر میں محدثین ہند کی عظیم الشان روایات کے وارث و امین حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی دامت برکاتہم کی تصنیفی و تالیفی زندگی کی حاصل، سرور دو عالم ﷺ کی سیرت پاک سے روشنی اور رہنمائی کے لیے موجودہ عہد کے تقاضوں اور جدید انسانی معاشرہ و مزاج کی مناسبت سے حضور پاک ﷺ کی رحمۃ للعالمینی کی دلنشیں، دلنواز اور دلکش تشریح علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرت النبی ﷺ کے سو سال بعد سیرت نگاری میں مجددانہ کارنامہ تین ضخیم جلدوں میں خیر و برکت کی حامل یہ سیرت مصطفی عرب و عجم کے اہل نظر کی داد و تحسین کے مطابق:

۱ حضور ﷺ کی ذات اور سیرت پر لکھنے کا مطلب ہے کہ حرمین شریفین پر بھی قلم اٹھایا جائے، یہ وہ نکتہ ہے جسے ڈاکٹر تقی الدین ندوی نے اس کتاب میں خاص طور پر ملحوظ رکھا۔
محمد رسول اللہ ﷺ رحمۃ للعالمین (ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی- سابق جنرل سکریٹری رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ)

۲ یہ سیرت پاک کے موضوع پر گراں قدر تصنیف ہے، میں اس کو شیخ ندوی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مہربانی اور فضل ربانی سمجھتا ہوں۔ (ڈاکٹر سعود بن ابراہیم الشریم- امام و خطیب مسجد حرام مکۃ المکرمہ)

۳ یہ جامع انسائیکلوپیڈیا ہے، مشرق و مغرب میں پوری امت اسلامیہ کے لیے گراں قدر تحفہ ہے۔
(ڈاکٹر ابولبابہ طاہر صالح حسین)

۴ یہ عظیم الشان کتاب جامعیت اور دلکشی میں بے مثال اور عظیم شاہکار ہے اور ایسی کتاب ہے جس میں افراط و تفریط دونوں انتہاؤں سے بچ کر اعتدال کا راستہ اختیار کیا گیا ہے، زبان عصر حاضر کے فہم کے مطابق ہے۔
(ڈاکٹر موفق بن عبداللہ- استاذ حدیث جامعہ ام القریٰ)

۵ بنیادی خوبی یہ ہے کہ سیرت نبوی پر لکھنے کے لیے جن باتوں کا علم ضروری ہے اس میں صاحب کتاب کمال مہارت کے حامل ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ایمان و عقیدہ کو مضبوطی حاصل ہوتی ہے۔ (مولانا سید محمد رابع ندوی)

دیدہ زیب کتابت، بہتر مجلد خوبصورت سرورق کے ساتھ تین جلدوں کا مکمل سیٹ حاصل کرنے کے لیے جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ یوپی اور دیوبند اور ندوہ کے مشہور مکتبوں سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

پتہ **جامعہ بُکڈپو** جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ یوپی
موبائل نمبر: 9450876465 9532829745
قیمت: 2000 خصوصی رعایت کے ساتھ قیمت: 750

فیضان محبت

ماں باپ کا احسان: قرض، جو کبھی ادا نہ ہو

محمد جاوید اختر ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

دین اسلام نے جن انسانی رشتوں کو سب سے زیادہ مقدس بنایا ہے، ان میں والدین کا رشتہ مقدم ہے، قرآن کریم میں توحید کے بعد جس حق کا ذکر آیا ہے، وہ والدین کے ساتھ حسن سلوک ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ والدین کا مقام محض سماجی نہیں؛ بلکہ خالص دینی و ایمانی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: "ایک صحابی خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ: میں جہاد کرنا چاہتا ہوں، آپؐ نے ارشاد فرمایا: کیا تیری ماں زندہ ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ: تو پھر اس (ماں کی خدمت) میں جہاد کر"۔ (سنن نسائی)

دوسرے اہل تعلق کا حق ان کی وفات پر ختم ہوجاتا ہے؛ لیکن والدین کا حق ان کی وفات کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ "حضرت ابو اسید مالک بن ربیعہ ساعدیؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ قبیلہ بنو سلیم کا ایک شخص آیا، اور عرض کیا: یارسول اللہ! کیا میرے والدین کے انتقال کے بعد بھی ان کے ساتھ نیکی کا کوئی حق مجھ پر باقی ہے جسے میں ادا کرسکوں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! ان کے لئے دعا کرنا، مغفرت طلب کرنا، ان کے وعدوں کو پورا کرنا، ان رشتہ داروں سے تعلق جوڑنا جن سے رشتہ والدین کے ذریعہ ہے، اور ان کے دوستوں کا احترام کرنا"۔ (سنن ابن ماجہ)

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا میں انسان کے وجود پر والدین سے بڑھ کر کسی کا احسان نہیں، اور ان کے احسانات کا بدلہ کبھی ادا نہیں کیا جاسکتا، ماں اپنی اولاد کو کارخانۂ ہستی تک پہنچانے کے لیے جس طرح اپنے پیٹ میں رکھتی ہے اور کروٹ کروٹ تکلیف اٹھاتی ہے، کیا اس کی کوئی قیمت ادا کی جاسکتی ہے؟ بچہ پیدا ہونے کے بعد قدرت نے اس کے سینے میں جو چشمۂ صافی رکھ دیا ہے، کس طرح وہ اس سے اپنے بچے کو آسودہ کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کے خون کی ایک ایک بوند دودھ کی شکل میں اس کمزور پودے کو تناور درخت بنانے میں خرچ ہوجائے؟ اپنے بچہ کے آرام کے لیے رات کی بے سکونی میں ہی اسے سکون آتا ہے اور اس کو آرام پہنچانے کے لیے وہ دن کا ایک ایک لمحہ ہنسی خوشی اور بے آرامی کے ساتھ گذارتی ہے، اگر بچے کو ایک کانٹا بھی چبھ جائے، تو ماں کی ممتا کچھ اس طرح بے قرار ہوجاتی ہے، کہ جیسے خود اس کو کوئی خنجر چبھ گیا ہو، ماں کا یہ پیار بچپن سے جوانی اور اگر عمر نے وفا کی تو جوانی سے بڑھاپے تک بچوں پر سایہ فگن رہتا ہے۔

باپ کا حال یہ کہ وہ دردر کی خاک چھانتا ہے، وطن چھوڑ کر بے وطن ہوجاتا ہے، گاڑھا پسینہ بہاتا ہے، اور ہر وقت اسے یہ آرزو بے چین رکھتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو زیادہ سے زیادہ بہتر حال میں رکھے، بچوں کے تھوڑے سے آرام کے لیے اپنی ضروریات کو تج کر معمولی حالت میں رہتا ہے، وہ سخت سے سخت تکلیف اٹھا سکتا ہے؛ لیکن اپنے بچوں کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا، خود مشقت برداشت کرسکتا ہے، لیکن چاہتا ہے کہ اپنے بچوں کے لیے ڈھیر ساری دولت چھوڑ جائے۔ کیا اس محبت کی کوئی قیمت ادا کی جاسکتی ہے؟ اور کیا اس بے غرضی اور ایثار کا دنیا میں کوئی صلہ دیا جاسکتا ہے؟ اسی لئے مذہب نے انسانی معاشرہ میں ہمیشہ والدین کے رشتہ کو سب سے زیادہ مقدس اور قابل احترام سمجھا ہے۔

لیکن اس وقت دنیا میں جس تہذیب کا بول بالا ہے، اس کی بنیاد احسان شناسی اور ایثار کے بجائے خود غرضی اور مطلب برآری پر ہے، اس لیے والدین جب اس عمر کو پہنچتے ہیں کہ ان سے کوئی مادی غرض وابستہ نہ ہو تو ان کو ایک بوجھ سمجھنے لگتے ہیں، بوڑھاپے میں والدین کی گفتگو جس میں بعض اوقات چڑچڑاہٹ شامل ہوجاتی ہے، ان کے لیے ناقابل برداشت بن جاتی ہے، والدین کا ان کے گھر میں رہنا بارِ خاطر ہوتا ہے۔

بیٹیوں کا حال یہ ہے کہ وہ سمجھتی ہیں کہ ماں باپ کی ذمہ داری صرف بیٹوں پر ہے، حالانکہ شرعاً ذمہ داری تمام امکانی ورثہ پر ہے، یہ صورتحال ہمارے معاشرہ میں بڑھتی جارہی ہے، مغربی سماج کے جو واقعات ہم سنتے تھے اور سن کر حیرت ہوتی تھی، اب اسی طرح کے واقعات خود ہمارے سماج میں پیش آرہے ہیں۔

اس اخلاقی گراوٹ پر توجہ کی سخت ضرورت ہے، اس لئے مسجدوں کے منبر و محراب سے بار بار نوجوانوں کو والدین کی اہمیت بتلائی جائے، اخبارات ورسائل کے ذریعہ سماج کو اس کے لیے بیدار کیا جائے، تعلیم میں اخلاقیات کے عنصر کو شامل کیا جائے، یہ بھی سمجھانے کی ضرورت ہے کہ بیوی کے الگ حقوق ہیں اور ماں باپ کے الگ، ان میں سے ایک کی وجہ سے دوسرے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے عمل سے نئی نسل کی تربیت کرنی چاہئے، اگر ایک شخص خود اپنے والدین کے ساتھ بہتر سلوک کرے، ان کی اطاعت وفرماں برداری کرے اور تواضع وانکساری کا مظاہرہ کرے، تو یہ خود ان کے بچوں کے لیے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا خاموش مگر مؤثر اور بہترین پیغام ہوگا، اسی لیے کہا گیا ہے کہ: "برّوا آباءکم تبرّ کم أبناء کم" (تم اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو، تمہارے بچے تمہارے ساتھ بہتر سلوک کریں گے)۔

☆☆☆

رسید کتب

تعارف وتبصرہ

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

محمد جمیل اختر جلیلی ندوی صاحب
کی چند قلمی خدمات

جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور، کرناٹک میں حدیث وفقہ کے استاذ جناب جلیلی ندوی صاحب کی متعدد قلمی کاوشیں دعوتِ مطالعہ دے رہی ہیں۔ مولانا ایک اچھے قلم کار ہیں، ان کے دینی و علمی مضامین 'تعمیرِ حیات' میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا قلم رواں ہے، اعتدال پسند ہے، اور وہ جو کچھ لکھتے ہیں مدلل لکھتے ہیں۔ حال ہی میں ان کی طرف سے جو کتابیں موصول ہوئی ہیں' وہ تعلیم، سیرت اور فقہ کے مختلف موضوعات پر ہیں، جس سے ان کے مطالعہ کا تنوع ظاہر ہوتا ہے۔

آیئے ان کی ایک ایک کتاب اٹھاتے ہیں، اور اس پر تفصیلی نظر ڈالتے ہیں:

۱-امتِ مسلمہ کی رہنمائی میں فتاوی کا کردار:

یہ کتابی سائز کے تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہے۔ عنوان کی ندرت قاری کے شوقِ مطالعہ کو مہمیز کر رہی ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب میں فقہ وافتا، اس کے مصادر و مآخذ، اصول و قواعد اور ان کے تاریخی سلسلہ کو پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلم سماج، خواہ عرب کا ہو یا عجم کا، کبھی اہلِ علم کی شرعی رہنمائی سے محروم نہیں رہا، اور اربابِ فقہ وافتاء وقضا نے ہر دور اور ہر مقام پر وقت و ماحول کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے شریعت کے احکام کو کتاب وسنت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ قابلِ عمل ہوں۔ انھوں نے علماء کے اختلاف کے اسباب اور اس کی شرعی حیثیت و حکمت پر بھی اطمینان بخش گفتگو کی ہے، اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اہلِ حق علماء کا اختلاف' دائرۂ عمل میں وسعت ہی پیدا کرتا ہے، شریعت کے لیے ضرر رساں یا امت کے لیے گمراہ کن نہیں ہے۔

کتاب کا آغاز سرنوشت (از مؤلف)، مقدمہ (از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ)، اور پیش لفظ (از مولانا ڈاکٹر اکرم ندوی) سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد کتاب کل چار ابواب پر مشتمل ہے؛ پہلا باب "مبادیات" ہے، جس میں فتوی و افتا کی لغوی و اصطلاحی تعریف، قضا وافتا میں فرق، موضوع، غرض و غایت، اہمیت، نزاکت، ضرورت، مفتی کے اوصاف، اجتہاد، اسلوب اور مصادر وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔

دوسرا باب "فتوی نویسی کی تاریخ" کا ہے۔ جس کا آغاز عہدِ نبوی سے ہوتا ہے۔ اسی کے ضمن میں مختلف فقہی مکاتبِ فکر کا تعارف ہے، جن میں مسالکِ اربعہ کے ساتھ اہلِ ظاہر، اہلِ تشیع، اہلِ اباضیت، اصحاب الرائے اور اصحاب الحدیث شامل رکھے گئے ہیں۔

تیسرا باب "برصغیر کی فتوی نویسی کی تاریخ" کے حوالہ سے ہے، جس کا آغاز تیرہویں صدی عیسوی میں غیاث الدین بلبن کے عہدِ حکومت سے دکھایا گیا ہے، اور بیچ کے ادوار اور ان کے اہم اور معروف فتاوی پر نظر ڈالتے ہوئے آخر میں 'آن لائن' فتوی نویسی پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور ہندوپاک وعرب کی معروف ویب سائٹس کی ایک مختصر فہرست درج کی ہے۔

چوتھے باب کا عنوان وہی ہے جو اس کتاب کا عنوان ہے۔ گویا شروع کے ابواب تمہید کا درجہ رکھتے ہیں اور اصل مدعا اس باب میں بیان کیا گیا ہے۔ اس باب کے جلی عناوین ہیں' عہدِ نبوی میں فتاوی کا کردار، عہدِ صحابہ میں کا کردار، عصرِ حاضر میں فتاوی کا کردار۔ مؤخر الذکر عنوان کے تحت' عصرِ حاضر کے بعض نازک اور اہم مسائل کو زیرِ بحث لایا گیا ہے، جن میں 'غیر مسلموں کے تہواروں میں مبارکباد دینا'، 'خیر کے کاموں میں سود کا استعمال'، 'نکاحِ مسیار'، 'ڈیجیٹل تصاویر کا استعمال'، 'آن لائن نکاح'، 'مالی جرمانہ' اور 'انشورنس' وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام شرعی مسائل میں انھوں نے عرب فقہاءِ عصر کی آراء کو بھی مدنظر رکھا ہے۔

آخر میں 'مراجع ومصادر' کی فہرست ۱۵۰ رسو سے زائد کتب پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے ایک عام قاری کو بھی یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ فقہ وفتاوی کیا ہے، اس کا تاریخی تسلسل کیا ہے، کن بنیادوں پر فتوی دیا جاتا ہے، وہ کونسی سیاسی وسماجی مصلحتیں ہیں جن کا شریعت لحاظ رکھتی ہے، کس حد تک ان کی رعایت کی گنجائش ہے، علماء میں بالخصوص عرب وعجم کے علماء میں باہمی اختلاف کیوں ہے، اور کس طرح ہر ایک کی رائے قابلِ استناد اور قابلِ قدر ہے؟۔

۲-مقاصدِ شریعت-تدوین وتعارف:

دینِ اسلام کے احکام درحقیقت انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو خوشحالی وآسودگی اور امن وآشتی عطا کرتے ہیں۔ شریعت کے ہر حکم کے پیچھے کوئی نہ کوئی حکمت اور مصلحت پنہاں ہے، جس کا لحاظ ناگزیر ہے۔ علماء وفقہاءِ امت نے شرعی مصادر میں

غور وخوض کر کے ان حکمتوں اور مصلحتوں کی چھان بین کی ہے، اور ان کو مقاصدِ شریعت کا نام دیا ہے۔

زندگی میں پیش آمدہ جدید مسائل کے حل کے لیے مقاصدِ شریعت کا جاننا ضروری ہے، ورنہ جن اغراض وغایات کے لیے خالقِ فطرت نے احکامِ شریعت وضع کیے ہیں‘ وہ فوت ہوجائیں گے، اور ان کے فوت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی بدامنی وانارکی کا شکار ہوجائے گی، آخرت کا خسارہ تو اپنی جگہ ہے ہی۔ چونکہ اس دور میں جو کہ تغیر اور تبدیلی کی رفتار میں گذشتہ ادوار سے بہت آگے ہے، جدید مسائل کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس لیے اربابِ افتاء اور قضاء کے لیے اس علم میں دسترس حاصل کرنا ناگزیر ہے۔

’مقاصدِ شریعت‘ کی اصطلاح گرچہ قدیم ہے اور علماءِ عرب عرصہ سے اس موضوع پر لکھتے آئے ہیں؛ لیکن اردو میں ابھی تک اس موضوع پر کوئی باضابطہ کتاب نظر سے نہیں گذری۔ یہی وجہ ہے کہ جلیلی صاحب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اور ایک انتہائی جامع اور مختصر رسالہ تالیف کیا ہے، جس میں انھوں نے موضوع کی ضخیم کتابوں کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے مقاصدِ شریعت کی اصطلاح، اس کا آغاز، اس کی تہذیب وتدوین، اس کا مفہوم ومراد، اس کی اقسام وخصوصیات، اس کے اصول وقواعد، اور ادلۂ شرعیہ وفقہی احکام کے ساتھ اس کے تعلق کو بیان کیا ہے۔

فاضل مصنف نے جس طرز پر اس رسالہ کو تالیف کیا ہے‘ اس کے بارہ میں کہا جاسکتا ہے کہ اس فن پر اردو میں یہ پہلی کاوش ایک ’انڈکس‘ یا ’نوٹ بک‘ کی شکل میں ہے، جس کا فائدہ یہ ہے کہ جہاں یہ ایک فقہ کے طالب علم کے لیے ابتدائی نصاب کا حصہ بن سکتی ہے، وہیں اربابِ افتاء وقضاء کے لیے ایک ’مذکرہ‘ یا ’ڈائری‘ کا کام بھی انجام دے سکتی ہے۔

’پیشِ لفظ‘ فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب اور ’تقریظ‘ مولانا محمد عبید اللہ اسعدی صاحب کے قلم سے ہے۔

۳-صحابیات کی طبی خدمات:

فاضل مصنف کی یہ تالیف بھی اپنے موضوع میں ندرت رکھتی ہے، تین سو سے زائد صفحات کی یہ مجلد کتاب‘ ان صحابیات رضی اللہ عنہن کے ذکر و تذکرہ سے عبارت ہے جنھیں علاج معالجہ سے مناسبت یا اس فن میں مہارت رہی ہے۔

کتاب شروع ہوتی ہے جناب ڈاکٹر ظفر الاسلام خان (ڈائرکٹر دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ) کے پیشِ لفظ اور جناب ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی (صدر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ) کی تقریظ سے۔ ہر دو میں اس موضوع کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے، اور اس کاوش کو سراہا گیا ہے۔ اس کے بعد خود مصنف کا مقدمہ ہے، جس میں ابتداءً انھوں نے مطلق تاریخِ طب پر وقیع کلام کیا ہے، قدیم طبی مکاتبِ فکر پر روشنی ڈالی ہے، پھر طبِ اسلامی اور طبِ نبوی کو موضوعِ سخن بنایا ہے، عہدِ نبوی میں صحابیات کی طبی مہارتوں کا ذکر کیا ہے، اور اس بات کا انکشاف کہ جب انھیں اس موضوع پر مطالعہ کی ضرورت پڑی تو تلاشِ بسیار کے بعد بھی عربی یا اردو زبان میں کوئی مستقل کتاب نہیں ملی۔ آگے ذکرِ صحابیاتؓ کے علاوہ خود یہ مقدمہ بھی کافی معلومات افزا ہے۔

کتاب میں کل ۳۵ر صحابیات کا ذکر ہے، جن کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔ اس تعارف میں اسلوب یہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے حسب نسب، قبولِ اسلام، ازواج واولاد اور دیگر احوال و کوائف بیان کیے گئے ہیں، اور آخر میں ان کی طبی مہارت وخدمات کا تذکرہ ہے۔ سب سے پہلے حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کا تذکرہ ہے، اس کے بعد ازواجِ مطہرات کی طبیبات کو لیا گیا ہے، بعد ازاں دیگر طبیبات کا ذکر ہے۔

فاضل مصنف نے بہت سی صحابیات کے بارہ میں خاصی تفصیلی جانکاری دی ہے، اور یہ تک بتلایا ہے کہ وہ طب کی کون سی شاخ میں مہارت رکھتی تھیں۔ اس کے لیے انھوں نے سیر وسوانح اور طب وتاریخ کی سینکڑوں کتابوں کو کنگھال کر معلومات جمع کی ہیں، پھر انھیں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ترتیب بھی دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علم وتعلیم، غزوہ وجہاد، حدیث و فقہ اور دیگر میدانوں میں صحابیات رضوان اللہ علیہن جمیعا، کی خدمات کا ذکر بکثرت ملتا ہے، لیکن ان کی طبی خدمات پر یہ مفصل کتاب بڑی چشم کشا ہے۔

۴-عصری نظامِ تعلیم -مسائل اور حل:

زیرِ نظر کتاب میں مسلمان بچے اور بچیوں کو خاص طور پر ہمارے ملک میں جو مسائل اور چیلنجز درپیش ہیں‘ ان کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے نہ صرف یہ کہ بڑی باریک بینی سے ان مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے؛ بلکہ شرعی اور فقہی نکتۂ نظر سے ان کا حل بھی بتایا ہے۔

موصوف محترم نے اپنی اس تالیف میں اسلام کا تعلیمی نظریہ پیش کیا ہے، علم کی عینی فرضیت اور کفائی فرضیت پر بات کی ہے، اسلامی طرز کے عصری تعلیمی اداروں کے قیام کی ضرورت کو ثابت کیا ہے، عصری اداروں میں شامل غیر شرعی اور غیر اخلاقی مضامین کی تعلیم، مخلوط تعلیم، جنسی تعلیم کے مسائل بیان کیے ہیں، فیس، ڈونیشن، رشوت، مالی جرمانہ مشرکانہ ترانے، یوگا، مخلوط تفریحی پروگرام، تعلیمی قرض، سرکاری تعلیمی اسکیمیں جیسے اہم موضوعات پر متنبہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ......

(بقیہ صفحہ ۲۲ر پر)

امن وانصاف

جمہوریت - ایک سیاسی واخلاقی کشمکش

محمد نفیس خان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

جمہوریت (Democracy) کا لفظ بظاہر جدید سیاسی لغت کا حصہ محسوس ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ ایک قدیم تصور ہے جس کی فکری جڑیں یونانی تہذیب میں پیوست ہیں۔ یہ اصطلاح یونانی لفظ Demokratia سے ماخوذ ہے، جو Demos (عوام) اور Kratos (حکمرانی یا اقتدار) سے مل کر بنی ہے، یعنی عوام کی حکمرانی۔ اگرچہ اس تصور کا ابتدائی ظہور قدیم یونان میں ہوا، تاہم جدید سیاسی معنی میں جمہوریت کا فروغ یورپ میں سولہویں صدی کے بعد ہوا، جب یہ انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں میں باقاعدہ مستعمل ہوئی۔

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد جو فکری انقلاب برپا ہوا، اس نے جمہوریت کے لیے فضا ہموار کی۔ اس دور میں بادشاہوں کے اس دعوے کو شدید چیلنج کیا گیا کہ وہ خدا کی طرف سے مقرر کردہ حاکم ہیں اور ان کی حکمرانی مقدس ہے۔ عوام نے مطلق العنان بادشاہت کے خلاف بغاوت کی اور ساتھ ہی کلیسا اور مذہبی طبقے کی سیاسی بالادستی کو بھی نشانہ بنایا۔ پادریوں کی اتھارٹی کمزور پڑی اور سیاست کو مذہبی تقدس سے الگ کر دینے کا تصور پروان چڑھا۔ نتیجتاً عوام کو اقتدار کا اصل سرچشمہ قرار دیا گیا اور یہ دعویٰ کیا گیا کہ انسان خود اپنی تقدیر کا معمار ہے۔ یوں مذہب، بادشاہت اور اخلاقی بالادستی سے آزاد ایک نیا سیاسی نظام وجود میں آیا جس کی بنیاد انسانی خواہش اور اجتماعی رائے پر رکھی گئی۔

مغربی جمہوریت کا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ عوام کے پاس ہے اور حکومت اسی وقت جائز ہے جب وہ عوام کی مرضی اور ووٹ سے قائم ہو۔ اس نظام میں آزادی کو مرکزی قدر کا درجہ دیا گیا ہے، جس کے تحت مذہبی آزادی، آزادیٔ اظہار، آزادیٔ صحافت، انجمن سازی اور سیاسی شرکت جیسے حقوق کو بنیادی انسانی حقوق قرار دیا جاتا ہے۔ بظاہر یہ سب تصورات نہایت دلکش اور انسان دوست محسوس ہوتے ہیں، مگر جب ان کے فکری اور عملی نتائج کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو ایک مختلف تصویر سامنے آتی ہے۔

جمہوریت کی فکری بنیاد مذہب اور سیاست کی مکمل علیحدگی کے تصور پر استوار ہے۔ اس علیحدگی کا لازمی اور ناگزیر نتیجہ یہ سامنے آیا کہ قانون اور اخلاقیات کا رشتہ مذہب ہی نہیں بلکہ کسی بھی مستقل اور آفاقی اخلاقی معیار سے منقطع ہو گیا۔

چنانچہ صحیح اور غلط، جائز اور ناجائز، خیر اور شر کے تعین کا اختیار کسی وحی الٰہی یا ثابت اخلاقی اصول کے بجائے عوامی رائے اور اکثریت کے بدلتے ہوئے رجحانات کے سپرد کر دیا گیا۔ چونکہ عوامی رائے اپنی فطرت میں تغیر پذیر، وقتی اور حالات کی تابع ہوتی ہے، اس لیے قانون اور اخلاق بھی کسی استحکام پر قائم نہ رہ سکے، بلکہ مسلسل تبدیلی اور اضطراب کا شکار ہوتے چلے گئے۔ جو بات آج اکثریت کی نظر میں قابلِ قبول اور قانونی قرار پاتی ہے، وہی کل ناپسندیدہ اور ناجائز ٹھہر سکتی ہے، اور جو عمل ماضی میں جرم، فحاشی یا اخلاقی انحطاط کی علامت سمجھا جاتا تھا، وہ آج ''آزادی'' اور ''انسانی حقوق'' کے نام پر قانونی تحفظ حاصل کر لیتا ہے۔

اسی اصول کے تحت یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ عناصر اور طرزِ عمل جو کسی معاشرہ میں فطری طور پر مجرمانہ یا اخلاقی دیوالیہ پن کی علامت سمجھے جاتے ہیں، رفتہ رفتہ نظامِ حکومت اور ریاستی ڈھانچے کے مؤثر اور مضبوط حصے بن جائیں۔ مزید یہ کہ جن امور کو مذہبی نقطۂ نظر سے صریحاً غلط، ناپسندیدہ یا مفسد قرار دیا جاتا ہے، جمہوری نظام میں انہیں آزادیٔ اظہار کے دائرے میں شامل کر کے نہ صرف جائز بلکہ بنیادی شہری حق کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔

یہی وہ بنیادی پہلو ہیں جہاں مغربی جمہوریت کی سب سے بڑی فکری کمزوری نمایاں ہوتی ہے۔ اس نظام نے اگرچہ بعض تاریخی کامیابیاں حاصل کی ہیں جیسے مطلق العنان بادشاہتوں کا خاتمہ اور شہری آزادیوں کا فروغ، لیکن اخلاقی بنیاد کے فقدان نے اسے شدید بحران سے دوچار کر دیا۔ جب اخلاق فیشن کی طرح بدلنے لگیں تو معاشرہ فکری اضطراب اور اقداری انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ مغربی معاشروں میں خاندان، جو انسانی تمدن کی بنیادی اکائی ہے، جمہوری آزادی کے نام پر کمزور پڑ گیا۔ نکاح، حیا، وفاداری اور والدین کے احترام جیسے تصورات فرسودہ قرار دیے جانے لگے، جس کے نتیجے میں خاندانی انتشار، ذہنی دباؤ اور سماجی بے چینی میں اضافہ ہوا۔

جمہوریت کا ایک بنیادی اصول اکثریت کی حکمرانی ہے، مگر عملی تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اکثریت ہمیشہ

حق پر نہیں ہوتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ حق اکثر اقلیت کے ساتھ رہا ہے، جب کہ اکثریت نے انبیاء اور مصلحین کی مخالفت کی۔ اس کے باوجود جمہوریت میں حق و باطل کا معیار محض عددی اکثریت بن جاتا ہے۔ اس طرزِ فکر نے نہ صرف فکری سطح پر مغالطے کو جنم دیا بلکہ اقلیتوں کے حقوق کو بھی مستقل خطرے میں ڈال دیا۔ نسلی، لسانی اور مذہبی کشمکش میں اضافہ ہوا اور معاشرہ طبقات میں بٹتا چلا گیا۔

عملی سطح پر بھی عوامی اقتدار کا تصور زیادہ تر ایک نظریاتی دعویٰ ثابت ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید جمہوری ریاستوں میں اصل فیصلے عوام نہیں بلکہ وہ طاقتور طبقات کرتے ہیں جو سرمایہ، میڈیا، صنعت اور بیوروکریسی پر قابض ہوتے ہیں۔ عام شہری چند سال میں ایک بار ووٹ ڈال کر یہ گمان کرتا ہے کہ وہ اقتدار میں شریک ہو گیا ہے، حالانکہ اقتدار کے حقیقی مراکز اس کی پہنچ سے بہت دور ہوتے ہیں۔ یوں جمہوریت عوامی حاکمیت کے بجائے مخصوص گروہوں کی بالواسطہ حکمرانی میں بدل جاتی ہے، جسے 'عوامی تائید' کے نام پر 'قانونی جواز' فراہم کر دیا جاتا ہے۔

سوویت یونین اور اشتراکی نظام کے زوال کے بعد جمہوریت کو عالمی سطح پر بے پناہ فروغ ملا۔ مختلف ممالک میں جمہوریت کے قیام کے نام پر مداخلت کی گئی اور اسے ایک عالمی قدر کے طور پر پیش کیا گیا۔ تاہم عملی طور پر یہ نظام مخصوص عالمی طاقتوں کے سیاسی اور معاشی مفادات کا ذریعہ بنتا چلا گیا۔ یوں جمہوریت ایک آفاقی اخلاقی اصول کے بجائے ایک سیاسی ہتھیار کی صورت اختیار کر گئی۔

ہندوستان، جو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہلاتا ہے، اس نظام کی عملی مثال پیش کرتا ہے۔ یہاں بظاہر عوامی حکومت قائم ہے، مگر انتخابی عمل کی حقیقت یہ ہے کہ بڑی تعداد میں عوام ووٹنگ میں حصہ ہی نہیں لیتی۔ ووٹ درجنوں جماعتوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور بالآخر ایسی حکومت وجود میں آتی ہے جسے مجموعی آبادی کے ایک محدود حصے کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اسے عوامی اور جمہوری حکومت کہا جاتا ہے، حالانکہ حقیقت میں اکثریت کی رائے حکومت کی تشکیل میں شامل نہیں ہوتی۔

ان تمام حقائق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مغربی جمہوریت دراصل شخصی یا جماعتی آمریت کی ایک مہذب اور خوش نما صورت ہے۔ یہ نظام انسان کو وقتی سیاسی شرکت کا احساس تو دیتا ہے، مگر اسے اخلاقی استحکام، فکری سکون اور تہذیبی توازن فراہم کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ آزادی، مساوات اور انصاف کے بلند بانگ دعووں کے باوجود یہ نظام خود اپنے اندر شدید تضادات رکھتا ہے اور انہی تضادات کے بوجھ تلے لڑکھڑاتا رہتا ہے۔

اس کے برعکس اسلام نے اقتدار کو نہ کسی فرد کا پیدائشی حق قرار دیا ہے اور نہ کسی طبقے یا جماعت کی ملکیت، بلکہ اسے ایک عظیم الٰہی امانت کے طور پر متعارف کرایا ہے، جس کا اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اسلامی تصورِ سیاست کی اساس یہی ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ اللہ رب العزت کے لیے خاص ہے، اور انسان محض اس کا نائب اور امانت دار ہے، جو اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں بلکہ الٰہی ہدایات اور مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے نظمِ اجتماعی قائم کرنے کا مکلف ہے۔ اس تصور میں حکمرانی اختیار نہیں بلکہ ذمہ داری ہے، اور اقتدار استحقاق نہیں بلکہ جواب دہی کا نام ہے۔

اسلامی نظام میں حکمران کی حیثیت ایک مطلق العنان فرمانروا کی نہیں ہوتی، بلکہ وہ شریعتِ الٰہی کا پابند، قانون کے سامنے جواب دہ اور عوام کے حقوق کا محافظ ہوتا ہے۔ یہاں قانون سازی انسانی خواہشات یا اکثریتی رجحانات کے تابع نہیں، بلکہ وحی کی روشنی میں، عدل و مصلحت کے اصولوں کے تحت انجام پاتی ہے۔ چنانچہ اسلام میں قانون، اخلاق اور سیاست الگ الگ دائروں میں بٹے ہوئے نہیں بلکہ ایک ہی اخلاقی مرکز سے جڑے ہوتے ہیں، جس کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے۔

اسی توازن کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی نظام میں آزادی، انصاف اور مساوات محض سیاسی نعروں کی صورت میں نہیں رہتیں بلکہ اخلاقی ذمہ داری کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہیں۔ حکمران کو یہ شعور ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف عوام بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی جواب دہ ہے، اور یہی احساس اسے ظلم، خودسری اور استبداد سے روکتا ہے۔ عوام کے حقوق محض قانونی دفعات نہیں بنتے بلکہ دینی فریضہ اور اخلاقی تقاضا قرار پاتے ہیں۔

حقیقت میں مغربی جمہوریت انسانیت کے مسائل کا حتمی حل نہیں۔ یہ نظام محض انسانی عقل، خواہش اور عددی طاقت پر قائم ہے، اور اسی وجہ سے دیرپا عدل اور حقیقی فلاح پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ انسانیت نے جب بھی وحی سے منہ موڑا، اسے تجربات کے نام پر ناکامی اور تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔

اگر دنیا واقعی امن، انصاف اور اخلاقی بقا کی متلاشی ہے تو اسے بالآخر اس نظام کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو وحی کی رہنمائی، شورائی مشاورت اور اخلاقی ذمہ داری کو یکجا کرتا ہے، ورنہ تاریخ کا سفر یونہی آزمائشوں، انتشار اور پچھتاوؤں کے دائرے میں گردش کرتا رہے گا۔

☆☆☆

فقہی مسائل

سوال و جواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

سوال: ایک عورت نے شوہر کو بیمار دیکھ کر اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اب یہ زندہ نہیں رہ سکتے ہیں، ایک خلع نامہ بنوایا اور بیماری ہی کی حالت میں دباؤ ڈال کر زبردستی خلع نامہ پر دسخط کروالیا تو کیا اس سے خلع ہوجائے گا؟

جواب: حدیث میں بلا ضرورت خلع کا مطالبہ کرنے والی عورت کو منافق کہا گیا ہے، خاص کر جب شوہر مریض ہو تب تو عام انسانی شرافت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس موقع پر اس کے ساتھ دلداری کی جائے نہ کہ طلاق یا خلع کا مطالبہ شروع کردیا جائے یقیناً عورت کا یہ مطالبہ شرعاً ناپسندیدہ ہے، لہٰذا اگر شوہر سے زبردستی خلع نامہ پر دستخط کرایا جائے اور شوہر زبان سے کچھ نہ کہے تو یہ خلع نہیں ہوگا۔

(ردالمحتار: ۴۴۰/۴)

سوال: اگر عورت خلع حاصل کرنے کے بعد چند دنوں کے اندر دوسرے مرد سے نکاح کر لے تو کیا یہ دوسرا نکاح ہوجائے گا؟ کیا جس طرح طلاق کے بعد عدت گزارنی ہوتی ہے، اسی طرح خلع میں بھی عدت ہے، آج کل یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض عورتیں شوہر سے علیحدگی کے بعد عدت گزارے بغیر فوراً دوسرے مرد سے نکاح کر لیتی ہیں، کیا شرعاً یہ نکاح معتبر ہوگا؟

جواب: بلاشبہ خلع کے بعد بھی عدت گزارنا ضروری ہے، اگر میاں بیوی میں تنہائی ہوچکی ہو، ہاں! اگر میاں بیوی میں تنہائی نہیں ہوئی تو اس صورت میں جس طرح طلاق کے بعد عدت نہیں ہے اسی طرح خلع کے بعد بھی عدت نہیں ہے، عدت کے مسئلہ میں احتیاط ضروری ہے، یاد رہے کہ جس طرح غیر کی بیوی سے نکاح جائز نہیں ہے اسی طرح غیر کی بیوی جو عدت طلاق یا عدت خلع یا عدت وفات گزار رہی ہے اس سے نکاح جائز نہیں ہے اور اگر کوئی کرلے تو اس کا اعتبار نہیں ہے، عدت کی مدت گزرنے کے بعد دوبارہ نکاح کرنا ہوگا۔

(الهداية، باب العدة: ۲)

سوال: آج کل بے قصور مسلم نوجوانوں کی رہائی کے لیے بعض مسلم تنظیمیں مقدمات لڑ رہی ہیں، کیا اس میں سودی رقمیں صرف کی جاسکتی ہیں؟

جواب: غریب اور محتاج قیدیوں کی رہائی کے لیے مقدمات لڑنے میں سودی رقمیں صرف کی جاسکتی ہیں۔ (فتاویٰ ہندیہ: ۴۰۲/۴)

سوال: بعض لوگ اپنی رقمیں بینک میں فکس ڈپازٹ کرتے ہیں، بعد میں منافع کے ساتھ جو رقمیں ملتی ہیں، ان سے حج اور عمرہ کرتے ہیں، اسی طرح لڑکیوں کی شادیوں میں بھی صرف کرتے ہیں، کیا شریعت اس کی اجازت دیتی ہے؟

جواب: فکس ڈپازٹ میں جو زائد رقمیں منافع کے نام پر ملتی ہیں، وہ شرعاً سود ہیں، ان کا استعمال اپنے کسی ذاتی کام میں کرنا یا ان سے حج و عمرہ کرنا یا لڑکیوں کی شادیوں میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ اس رقم کو بلا نیت ثواب غریبوں میں تقسیم کردینا لازم ہے۔ (ردالمحتار: ۲۶۲/۶)

سوال: سودی رقم سے غریب بچیوں کی شادیاں کرائی جاسکتی ہیں؟

جواب: غریب بچیاں یا ان کے اولیاء کو وہ رقمیں دی جائیں پھر وہ خرچ کریں تو شرعاً اس کی گنجائش ہے۔

(الاشباہ والنظائر، القاعدۃ الخامسہ: ۱۴۹)

سوال: بینک سے ملنے والی سودی رقمیں غریب اعزہ واقارب پر صرف کرنا درست ہے یا نہیں؟ بعض بغیر بتائے ان کی ضروریات میں سودی رقم صرف کردیتے ہیں، کیا ایسا کرسکتے ہیں؟

جواب: غریب اور مستحق زکوٰۃ اعزہ و اقارب پر یہ رقمیں صرف کی جاسکتی ہیں۔

(بذل المجهود، کتاب الطهارة: ۲۵۹/۱)

سوال: کبھی کبھی بجلی بل غلط آجاتا ہے اور اس کی ادائیگی دشوار ہوجاتی ہے، کیا صرفہ سے زائد بل ادا کرنے میں سودی رقم دی جاسکتی ہے؟

جواب: بجلی استعمال کرنے والے کو جب یہ یقین ہو کہ بل صرفہ سے زائد ہے اور خود اس کی ادائیگی مشکل ہے تو سرکاری بینک سے حاصل شدہ سود کی رقم سے صرفہ سے زائد بل کی ادائیگی میں دی جاسکتی ہے۔

(ردالمحتار: ۱۸۲/۶)

سوال: سودی رقم مسجد کے استنجانے بنوانے میں لگائی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب: سودی رقم چونکہ مال حرام ہے، اس لیے اس کا مصروف ضرورت مند لوگ ہیں جن پر بلا نیت ثواب صرف کرنا لازم ہے، مسجد کے استنجانے بنوانے یا دیگر رفاہی کاموں میں لگانا شرعاً درست نہیں ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من تصدق بعدل تمرة من كسب طيب، ولا يقبل الله الا الطيب.

(صحيح البخاري: ۱۸۹/۱)

☆☆☆

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

باسمہ تعالیٰ

Date 10th January 2026

تاریخ ۱۰/جنوری ۲۰۲۶ء

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی وتربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین ودنیا کی جامعیت اور علم وروحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری وامتیاز کا اعلان واظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دار العلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون واعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات وعطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) محمد عمار حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA

عطیات	A/c No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c No. 1086 3759 766

IFSC CODE : SBIN0000125 - STATE BANK OF INDIA, MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:
NADWATUL ULAMA
اور اس پتہ پر ارسال کریں:
Nizamat office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marge, Lucknow - 226007 (U.P.)
معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر
+91-8736833376
پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔
فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا